فہرست

شذرات	مسلمانوں کا مسئلہ	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۸۲-۲۸۶)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	نماز فجر اور نماز عصر کا اختتامی وقت	زاویۂ فراہی	۱۷
	تقدیر اور شک وشبہ	طالب محسن	۲۱
دین ودانش	قانون عبادات (۶)	جاوید احمد غامدی	۲۳
اصلاح ودعوت	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	ریحان احمد یوسفی	۳۱
حالات ووقائع	المیۂ طالبان وافغانستان	ڈاکٹر محمد فاروق خان	۴۳
	نواب زادہ نصر اللہ کی جانشینی	خورشید احمد ندیم	۵۴
	فکر اصلاحی کا امین	ڈاکٹر صاحب زادہ انوار احمد بگوی	۵۷
تبصرۂ کتب	''آئینۂ کردار''	معظم صفدر	۶۱
اشاریہ	ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۳ء		۶۵
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مسلمانوں کا مسئلہ

ہم مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال تک عالم کی مسند اقتدار پر فائز رہنے کے بعد معزول ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ رونما ہوئے تین چار صدیاں بیت گئی ہیں۔قوموں کی زندگی میں یہ عرصہ نشاۃ ثانیہ کے لیے تو کافی نہیں ہوتا، مگر اس امر کے لیے بہت کافی ہوتا ہے کہ کوئی قوم زوال کے اسباب متعین کر کے ان کے تدارک کے لیے سرگرم ہو جائے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اسباب زوال کا تعین تو کجا، ابھی تک اپنی معزولی کے بارے میں قدرت کا فیصلہ ہی نہیں جان سکے۔ دنیا کی محکوم محض قوم ہونے کے باوجود ہم تسلط و اقتدار کی نفسیات میں جی رہے ہیں۔ گویا ایوان عالم میں پابند سلاسل کھڑے ہیں اور تسخیر کائنات کا اعلان کر رہے ہیں۔ ایک عظیم داستان سفاہت ہے جو ہم نے گزشتہ دو صدیوں میں رقم کی ہے۔ یہ داستان کسی خاص خطے یا نسل سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ جہاں جہاں ہماری اجتماعیت موجود ہے، اس کے ابواب بکھرے پڑے ہیں۔ افغانستان کی جنگ اسی داستان کا ایک الم انگیز باب ہے۔ اسے پڑھ کر اہل دنیا حیران ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں جو اجتماعی اخلاقیات میں تنزل کے آخری مقام پر کھڑے ہیں اور اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ دنیا اخلاق کا درس ان سے سیکھے۔ جدید علوم و فنون کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں اور تمنا ہے کہ ان کی ہر بات مستند سمجھی جائے۔ معمولی دفاع کی صلاحیت سے محروم ہیں، مگر دنیا پر چڑھ دوڑنے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں۔ اپنے پروردگار سے بے گانہ ہیں اور پھر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت و رحمت انھی کے لیے خاص ہے۔

ہم مسلمانوں کی یہ حالت لائق صد افسوس ہے، مگر ماتم اس بات کا ہے کہ مسلمان قوم کو اس مرض میں مبتلا کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھیں منصب مسیحائی حاصل ہے۔ ان کی اس مسیحائی کا نظارہ مسجدوں کے منبروں اور مذہبی جلسوں کے اسٹیجوں پر کیا جا سکتا ہے۔ جہاں سے انقلاب، جہاد اور تباہ کر دو، جلا کر راکھ بنا دو اور جان سے مار ڈالو کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام کا ہدف اصلی دنیا پر غلبہ اور حکمرانی قائم کرنا ہے، اس لیے ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے لیے پوری جدوجہد کرے۔ اس سے قطع نظر کہ یہ مقدمہ بجائے خود صحیح بھی ہے یا نہیں، ان علم برداران

انقلاب کا طرزِ عمل اپنے مقاصد ہی کے منافی ہے۔ اس ہدف کی طرف بڑھنے کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ایک جانب اپنے اخلاق وکردار کو اس قدر بلند کیا جائے کہ اقوامِ عالم کی نظریں ان کی جانب اٹھنی شروع ہو جائیں اور دوسری طرف دورِ جدید کے اسلحہ سے اپنے آپ کو لیس کیا جائے اور اس امرِ واقعی کا ادراک کر لیا جائے کہ دورِ حاضر کے اسلحہ تیر و تفنگ اور گولا بارود نہیں، بلکہ علم و ہنر اور اقتصادی وسائل ہیں۔

اس تناظر میں اگر ہم اپنے وجودِ اجتماعی کا جائزہ لیں تو چند در چند مسائل کی ایک فہرست رقم کی جاسکتی ہے، مگر ان کے لیے جامع ترین الفاظ جہالت اور غربت ہیں۔ یہ امراض ہمارے پورے وجود میں ناسور کی طرح سرایت کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے اخلاق وکردار، تعلیم وتعلم اور نظم واجتماع میں اس کے مظاہر بالکل نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اخلاق وکردار کے حوالے سے ہم ان مظاہر کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو معلوم ہو گا کہ ہمارا وجودِ اجتماعی ان اقدار سے بھی خالی ہو چکا ہے جو انسانوں کے مابین ہمیشہ مسلم رہی ہیں اور جنھیں اسلام نے اپنے شعار کے طور پر پیش کیا ہے۔ احترامِ انسانیت کی قدر جس پر معاشرت کی اساس قائم ہوتی ہے، ہمارے ہاں اس طرح پامال ہو رہی ہے کہ دوسروں کی عزتِ نفس اور ضمیر ورائے کا احترام تو ایک طرف، انسانی جان بھی اب ہمارے لیے محترم نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محض اختلافِ رائے کی بنا پر دوسرے انسان کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ عدل وانصاف کی قدر جس کی بدولت کوئی معاشرہ امن وآشتی کا گہوارہ بنتا ہے، ہمارے ہاں بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر ہر معاملے کو اغراض کے حوالے سے دیکھتے اور مفادات کی ترازو میں تولتے ہیں۔ رواداری اور صبر وبرداشت کی اقدار سے انسانوں کے مابین محبتیں پروان چڑھتی اور نفرتیں ختم ہوتی ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان کے بجائے تعصب، عناد اور اشتعال ہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ احترامِ قانون کی قدر پر کسی اجتماعیت کی سلامتی کا انحصار ہوتا ہے، مگر ہمارا عام رویہ یہ ہے کہ پابندیِ قانون کو ہم اپنی توہین تصور کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم جہاں موجود ہوتے ہیں، وہاں انارکی اور بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح شرف ووقار کے تحفظ کے لیے خودداری کی قدر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کوئی قوم اس سے محروم ہو جائے تو اس کے لیے اقوامِ عالم میں مقام حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دنیا میں ایک بھکاری قوم کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ اس کی تفصیل محض یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی معاشی ضروریات کے لیے دوسروں کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، بلکہ علمی تحقیقات، فنی ایجادات اور تہذیبی معیارات کے لیے بھی ہم دوسروں کی نظرِ عنایت کے منتظر رہتے ہیں۔

یہ اخلاقی اقدار کے بارے میں ہماری غربت وجہالت کے مظاہر ہیں۔ تعلیم وتعلم کے میدان میں یہ صورت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے تمام تر معانی کے ساتھ ہم پر منطبق ہو رہے ہیں۔ ہر اس شعبۂ زندگی میں جہاں تعلیم ہی کلیدِ ترقی وبقا ہے، ہم پر پژمردگی طاری ہے۔ فلسفہ وحکمت، علم وہنر، شعر وادب، قانون و سیاست، فکر وفن، غرض ہر میدان میں ہمارا شمار دنیا کی پس ماندہ ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ ریاضی، کیمیا، طبیعیات، فلکیات،

سیاسیات اور اقتصادیات کے میدانوں میں ہم ان علوم کی ابجد سے بھی ناواقف ہیں جن میں بعض اقوام برسوں کا سفر طے کر کے کمال فن کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ دنیوی علوم میں ہماری اس جہالت وغفلت نے ہمارے لیے مادی ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیے ہیں، معاملہ اگر یہیں تک رہ جاتا تو پھر بھی غنیمت تھی، مگر ہم نے اس سے آگے بڑھ کر علوم دینیہ کے میدان میں بھی اسی طرز عمل کا اظہار کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم حامل دین متین ہونے کی وجہ سے جو سرمایۂ علم واخلاق اہل دنیا کو منتقل کر سکتے اور اس طرح اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکتے تھے، اسے کھو چکے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں تنزل وانحطاط کا یہ مقام بھی آجاتا ہے کہ وہ ترقی کے خارجی عوامل سے بے نیاز ہو جاتی ہیں، مگر یہ صورت حال اس وقت المیہ بن جاتی ہے جب وہ اپنے اثاث البیت ہی سے غافل ہو جائیں۔ دین کے معاملے میں ہم اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

اس غربت وجہالت کا ایک اور منظر ہمارے نظم اجتماع میں بھی نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اجتماعی ادارے جن پر قوم کی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے، بے علمی، بدنظمی اور بدعنوانی کے امراض میں اس قدر مبتلا ہو گئے ہیں کہ ان کی اصلاح اور ان کی بنا پر ترقی کا تصور ہی محال ہے۔ سیاسی ادارے 'امرھم شوریٰ بینھم' کی اساس سے محروم ہیں۔ چنانچہ حکومت نہ مسلمانوں کی رائے سے قائم ہوتی، نہ ان کی تائید سے قائم رہتی اور نہ اس سے محروم ہو جانے کے بعد لازماً ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں نہ عوام سیاسی اعتبار سے پوری طرح باشعور ہو سکے ہیں اور نہ قیادت کی چھان پھٹک کا عمل مکمل ہو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے داخلی اور خارجی اہداف عمل متعین ہی نہیں کر سکے۔ معاشی نظام کے حوالے سے دیکھیں تو ہم غربت وافلاس کی چکی میں مسلسل پس رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات ہر لحاظ سے واضح ہے کہ یہ غربت ہم پر اللہ کی آزمایش کے طور پر نہیں آئی، بلکہ ہماری اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا نتیجہ ہے۔ اس میدان میں سود کے خاتمے کے نعرے تو بہت لگائے جا رہے ہیں، مگر اس بات کا ادراک کر کے کہ سود کس طرح ناسور کی طرح انسان کے وجود اجتماعی میں سرایت کیے ہوئے ہے، نہ ہم عوام میں شعوری تبدیلی لانے کے لیے سرگرم ہیں اور نہ ارباب حل وعقد کے سامنے متبادل نظام معیشت کی تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ سماجی حوالے سے دیکھیں تو ایک دوسرے کے غم بانٹنے کا طرز عمل بھی ہم چھوڑ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں غربت وافلاس کی انتہا اور حکومتوں کی رفاہی امور کی طرف عدم توجہی نے عام آدمی کے مسائل کو بہت بڑھا دیا ہے۔ اس پر مستزاد نفسا نفسی کی فضا ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ قیمتی انسانی جانیں دواؤں کی امید میں سسک سسک کر ضائع ہو جاتی ہیں، مناسب بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے بچیاں اپنے گھروں سے رخصت نہیں ہو پاتیں اور ذہین نوجوانوں کو تعلیم ترک کر کے کارخانوں کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ شرم وحیا، ادب واحترام اور خاندانی وقار جیسی ہماری نمائندہ اقدار غیر مستحکم ہو رہی ہیں۔ رفاہ عامہ کے ادارے اول تو نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں، وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ تعلیمی نظام کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد اول علم ودانش نہیں، بلکہ روزگار کا حصول ہے۔ تعلیمی ادارے مذہبی اور غیر مذہبی اور

اردو اور انگریزی کی غیر فطری تفریق پر مبنی ہیں۔ ان میں بھی نصابات فرسودہ، اساتذہ غیر تربیت یافتہ اور طلبہ محنت سے جی چرانے والے ہیں۔ خواتین جنھیں نئی نسل کو پروان چڑھانا ہوتا ہے، ان کی تعلیم کو کہیں ناجائز اور کہیں غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ عدالتی نظام ایک ایسے بازار کے مانند ہے جس میں جنس انصاف مایہ دار کے لیے ارزاں اور بے مایہ کے لیے ناپید ہے۔ مذہبی اداروں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے پاس تعلیم پانے کے لیے جائیں تو تقلید کا درس ملتا ہے، تربیت حاصل کرنے کے لیے جائیں تو سمع وطاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اگر عبادت کے لیے جائیں تو بعض اوقات فرقہ بندی کے نام پر ہدیۂ جان بھی وصول کر لیا جاتا ہے۔

ان ابتر حالات میں یہ ضروری ہے کہ کچھ اصحاب حکمت و دانش قوم میں ان مسائل کا شعور پیدا کرنے کے لیے کھڑے ہوں اور ان کے تدارک کے لیے جدوجہد کریں۔ اس ضمن میں ہمارے نزدیک حسب ذیل مقاصد کو سامنے رکھ کر لائحۂ عمل تشکیل دینا چاہیے۔

۱۔ اخلاقی اقدار کا فروغ

اول یہ کہ مسلمات اخلاق کو لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ کیا جائے اور عمل کو ان کے مطابق ڈھالنے کے لیے انھیں تربیت دی جائے۔ انھیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کی نفسیات میں جینے کے بجائے دعوت کے ذریعے سے لوگوں کی اخلاقی اصلاح کو اپنا مقصد بنائیں۔ دنیا کو آزمایش گاہ جانیں اور اہل دنیا کو حق وصداقت اور دین و اخلاق کی نصیحت کرتے ہوئے ان کا ہدف آخرت میں اپنی معذرت پیش کر کے جہنم کے عذاب سے بچنا ہو۔ احترام انسانیت، حق پرستی، رواداری، عدل اور دیانت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو خود بھی اپنائیں اور دوسروں کو بھی ترغیب دیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۔ تعلیم کی ترغیب

دوم یہ ہے کہ افراد قوم کے اندر طلب علم اور تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ انھیں بتایا جائے کہ تعلیم افراد قوم کو فعال بناتی اور اس طرح قومی تعمیر و ترقی کی راہیں کھولتی ہے۔ انھیں سمجھایا جائے کہ تعلیم کا مقصد اول روزگار نہیں، بلکہ علم و دانش کا حصول ہونا چاہیے۔ لوگوں کو دینی اور دنیوی، دونوں طرح کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ وہ مادی ترقی کے لیے دنیوی تعلیم پائیں اور اخلاقی ترقی اور اخروی کامیابی کی راہیں دریافت کرنے کے لیے دینی تعلیم حاصل کریں۔

۳۔ اجتماعی امور میں رہنمائی

سوم یہ ہے کہ قومی اور اجتماعی اداروں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا جائے۔ اس ضمن میں پہلے دو جہتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ان اداروں میں پائی جانے والی خامیوں کی نشان دہی کی جائے اور دوسرے یہ کہ ان خامیوں کی اصلاح کے لیے تجاویز مرتب کی جائیں۔ پھر عوام کے اندر اصلاح احوال کا شعور پیدا کیا جائے اور ارباب اقتدار کو پوری دردمندی کے ساتھ

مثبت تبدیلیوں کی طرف متوجہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر نظم سیاسی کے بارے میں 'امرھم شوریٰ بینھم' کے قرآنی حکم کو اساسی اصول کی حیثیت سے اختیار کرنے اور حکمرانوں کے معیار زندگی کو عام شہری کے برابر لانے پر اصرار کیا جائے۔ معیشت کے شعبے میں قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کا وسیع بندوبست قائم کیا جائے اور اس کے علاوہ کوئی اور ٹیکس ہرگز عائد نہ کیا جائے۔ معاشرت کے باب میں خاندان کی اہمیت اجاگر کی جائے اور ایسا سماج تشکیل دیا جائے جس میں شرف و وقار کا معیار حشمت واقتدار نہیں، بلکہ علم و دانش اور اخلاق و تقویٰ قرار پائے۔ تعلیم کے شعبے میں رائج تفریق ختم کر دی جائے اور نصابات کو قدامت اور تقلید سے پاک کیا جائے۔ مذہبی اداروں میں اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ دینی جماعتوں کا اختلاف نظر دشمنی اور عناد کی صورت نہ اختیار کرنے پائے اور مذہب کے نام پر قتل و غارت اور دہشت گردی کی فضا نہ پیدا کی جائے۔

۴۔ پس ماندگی کے خلاف جدوجہد

چہارم یہ کہ مسلمانوں میں اس بات کا شعور پیدا کیا جائے کہ وہ سائنس اور اقتصادیات کے میدان میں اپنی جدوجہد شروع کر دیں۔ موجودہ زمانے میں ترقی کے اصل میدان یہی ہیں۔ اس شعور کی بیداری کے ساتھ مسلمانوں کو اس حقیقت حال سے باخبر کیا جائے کہ ان میدانوں میں پس ماندگی کی وجہ سے وہ دنیا میں بے یار و مددگار ہیں۔ دنیا پر تسلط و بالادستی تو بہت دور کی بات ہے، وہ اپنی ریاستوں کے اندر بھی حقیقی اقتدار اعلیٰ سے محروم ہیں۔ وہ مغرب کو مفتوح کرنا چاہتے ہیں، مگر اس حقیقت کے ادراک سے عاری ہیں کہ مغرب کے تہذیب و تمدن، فکر و فلسفہ اور علم و فن نے ان کے مادی وجود کے ساتھ ساتھ ان کے دل و دماغ کو بھی مغلوب کر لیا ہے۔ ان کے اہل دانش یورپ کی زبان بولتے اور اسی کی اقدار کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، ان کے حکمران اسی کی قصیدہ خوانی کرتے اور کاسۂ گدائی لے کر اسی کے دروازوں پر دستک دیتے ہیں، ان کے ہنر منداسی کے فنون کی تفہیم کو اپنی تخلیق کی معراج تصور کرتے ہیں، ان کے عوام الناس اسے جنت ارضی سمجھتے اور اس کے حصول کے لیے اپنا معاشرہ، اپنا وطن اور اپنا خاندان تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر وہ مغرب پر غلبے کا نعرہ لگاتے ہیں تو اسے زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی عارضے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ مصائب میں گھرے لوگوں کی مدد

پنجم یہ کہ اپنے گرد و پیش میں موجود لوگوں کی مشکلوں اور ضرورتوں پر نگاہ رکھی جائے اور ممکن حد تک ان کی مدد کی جائے۔ کوئی بیمار ہے تو اس کے لیے دواؤں اور علاج معالجے کا بندوبست کیا جائے۔ کوئی طالب علم ضرورت مند ہے تو اس کے لیے فیس اور کتابوں کا انتظام کیا جائے۔ کسی کو بچی کی رخصتی کے لیے تعاون درکار ہے تو اس کی مدد کی جائے۔ اس ضمن میں ایسا نیٹ ورک وجود میں آنا چاہیے کہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت آپس میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

_____ منظور الحسن

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۵۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡٓا، اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى، فَاكۡتُبُوۡهُ، وَلۡيَكۡتُبۡ
بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ، وَ لَا يَاۡبَ كَاتِبٌ اَنۡ يَّكۡتُبَ، كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ، فَلۡيَكۡتُبۡ
وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَقُّ، وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ، وَ لَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا، فَاِنۡ كَانَ
الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا، اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ، فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ
بِالۡعَدۡلِ، وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ، فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ، فَرَجُلٌ

ایمان والو، (قرض کے معاملات، البتہ ہوں گے۔ لہٰذا) تم کسی مقرر مدت کے لیے ادھار کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لو اور چاہیے کہ اُس کو تمھارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور جسے لکھنا آتا ہو، وہ لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ جس طرح اللہ نے اُسے سکھایا ہے، وہ بھی دوسروں کے لیے لکھ دے۔ اور یہ دستاویز اُسے لکھوانی چاہیے[۷۳۰] جس پر حق عائد ہوتا ہو۔ اور وہ اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرے اور اُس میں کوئی کمی نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو

[۷۳۰] اصل میں لفظ 'فليملل' استعمال ہوا ہے، اِس کی ایک صورت 'املاء' بھی ہے۔ عربی زبان میں تضعیف کے دو حرفوں میں سے ایک کو 'ی' میں تبدیل کر کے لفظ کو ہلکا کر لینے کی یہ صورت عام ہے۔ قرآن مجید میں 'يتسنى' اور 'يتصدى' اِسی کی مثالیں ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ، اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى، وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا، وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا

اُس کے ولی کو چاہیے کہ وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔ اور تم اِس پر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی گواہی کرا لو، لیکن اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، تمھارے پسندیدہ گواہوں میں سے۔ دو عورتیں اِس لیے کہ اگر ایک الجھے تو دوسری یاد دلا دے[۷۳۱]۔ اور یہ گواہ جب بلائے جائیں تو اُنھیں انکار نہیں

---

[۷۳۱] اِس آیت میں گواہی کا جو ضابطہ بیان ہوا ہے، اُس کے بارے میں دو باتیں واضح رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اِس ضابطے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ صرف دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دستاویزی شہادت کے لیے گواہ کا انتخاب ہم کرتے ہیں اور واقعاتی شہادت میں گواہ کا موقع پر موجود ہونا ایک اتفاقی معاملہ ہوتا ہے۔ ہم اگر کوئی دستاویز لکھتے ہیں یا کسی معاملے میں کوئی اقرار کرتے ہیں تو ہمیں اختیار ہے کہ اُس پر جسے چاہیں، گواہ بنائیں۔ لیکن زنا، چوری، قتل، ڈاکا اور اِس طرح کے دوسرے جرائم میں جو شخص بھی موقع پر موجود ہوتا ہے، وہی گواہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ شہادت کی اِن دونوں صورتوں کا فرق اِس قدر واضح ہے کہ اِن میں سے ایک کو دوسری کے لیے قیاس کا مبنیٰ نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری یہ کہ آیت کے موقع و محل اور اسلوبِ بیان میں اِس بات کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ اِسے قانون وعدالت سے متعلق قرار دیا جائے۔ اِس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اِس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اِس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ اِس کے مخاطب ادھار کا لین دین کرنے والے ہیں اور اِس میں اُنھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اگر ایک خاص مدت کے لیے اِس طرح کا کوئی معاملہ کریں تو اُس کی دستاویز لکھ لیں اور نزاع اور نقصان سے بچنے کے لیے اُن گواہوں کا انتخاب کریں جو پسندیدہ اخلاق کے حامل، ثقہ، معتبر اور ایمان دار بھی ہوں اور اپنے حالات و مشاغل کے لحاظ سے اِس ذمہ داری کو بہتر طریقے پر پورا بھی کر سکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس میں اصلاً مردوں ہی کو گواہ بنانے اور دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے تاکہ گھر میں رہنے والی یہ بی بی اگر عدالت کے ماحول میں کسی گھبراہٹ میں مبتلا ہو تو گواہی کو ابہام و اضطراب سے بچانے کے لیے ایک دوسری بی بی اُس کے لیے سہارا بن جائے۔ اِس کے یہ معنی، ظاہر ہے کہ نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے کہ عدالت میں مقدمہ اُسی وقت ثابت ہوگا، جب کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اُس کے بارے میں گواہی دینے کے لیے آئیں۔ یہ ایک معاشرتی ہدایت ہے جس کی پابندی اگر لوگ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ. ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا،
اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ، فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا
تَكْتُبُوْهَا، وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ، وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ، وَاِنْ تَفْعَلُوْا
فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ، وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. ﴿۲۸۲﴾

کرنا چاہیے۔ اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اُس کے وعدے تک اُسے لکھنے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اِس سے تمھارے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ہاں، اگر معاملہ روبرو اور دست گرداں نوعیت کا ہو، تب اُس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ اور سودا کرتے وقت بھی گواہ بنا لیا کرو، اور (متنبہ رہو کہ) لکھنے والے یا گواہی دینے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے، اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ وہ گناہ ہے جو تمھارے ساتھ چپک جائے گا[۷۳۲]۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور (اِس بات کو سمجھو کہ) اللہ تمھیں تعلیم دے رہا ہے، اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے[۷۳۳]۔ ۲۸۲

کریں گے تو اُن کے لیے یہ نزاعات سے حفاظت کا باعث بنے گی۔ لوگوں کو اپنی صلاح وفلاح کے لیے اِس کا اہتمام بہرحال کرنا چاہیے، لیکن مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے یہ کوئی نصاب شہادت نہیں ہے جس کی پابندی عدالت کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ کی تمام ہدایات کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ طریقہ اللہ کے نزدیک زیادہ مبنی بر انصاف ہے، گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے، اور اس سے شبہوں میں پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

[۷۳۲] اصل الفاظ ہیں: 'فانہ فسوق بکم'۔ اِن میں ساتھ لگ جانے یا چپک جانے کا مفہوم عربیت کی رو سے متضمن ہے اور 'فسوق' کے بعد 'ب' اِس پر دلالت کرتی ہے۔

[۷۳۳] اِس آیت کے احکام کا خلاصہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اِس طرح بیان فرمایا ہے:

''جب کوئی قرض لین دین ایک خاص مدت تک کے لیے ہو تو اُس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اِس میں کوئی دغل فشل نہ کرے اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو، اُس کو چاہیے کہ وہ اِس خدمت سے انکار نہ کرے۔ لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے، اِس نعمت کا شکر یہ ہے کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے۔ اِس نصیحت کی ضرورت اِس وجہ سے پیش آئی کہ اُس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور اُن کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اُس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اُس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی۔ وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرض دار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اُس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اِس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحب حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اُس کا ولی یا وکیل ہو، وہ اُس کا قائم مقام ہو کر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

اِس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہوگی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ 'من رجالکم' یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں۔ جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین اُن کو جانتے پہچانتے ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ 'ممن ترضون' یعنی پسندیدہ اخلاق و عمل کے، ثقہ، معتبر اور ایمان دار ہوں۔

اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اِس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اِس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اُس کا سد باب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے، بلکہ اُس کی مزاجی خصوصیات اور اُس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اُس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے، اِس وجہ سے شریعت نے اِس کے اٹھانے میں اُس کے لیے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔ یہ موضوع اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سورۂ نساء میں زیر بحث آئے گا۔

جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، عند الطلب اُن کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے۔ اِس لیے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء اللہ ہونے کے پہلو سے اِس امت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

قرض لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدت کے لیے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے تو اُس کو قید تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیے۔ جو لوگ اِس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں، وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.com

بَعۡضُکُمۡ بَعۡضًا، فَلۡیُؤَدِّ الَّذِی اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَہٗ، وَلۡیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ، وَ لَاتَکۡتُمُوا

سکتا ہے[۷۳۴]۔ پھر اگر ایک دوسرے پر بھروسے کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس (رہن کی وہ چیز) امانت رکھی گئی ہے، وہ یہ امانت واپس کر دے اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے[۷۳۵]۔ (اور اِس معاملے پر گواہی

ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں جن کے نتائج بڑے دوررس نکلتے ہیں۔

مذکورہ بالا ہدایات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق وعدالت سے قرین، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک ونزاع سے بچانے والی ہیں، اِس لیے معاشرتی صلاح وفلاح کے لیے اِن کا اہتمام ضروری ہے۔

دست گرداں لین دین کے لیے تحریر وکتابت کی پابندی نہیں ہے۔

ہاں، اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید وفروخت ہوئی ہے تو اُس پر گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا تصفیہ ہو سکے۔

نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لیے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی وتمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اِس وجہ سے اُن کو بلاوجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اِس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں، اُس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اُس کے گواہوں کی شامت آ جاتی ہے۔ یہ بے چارے ہتک، اغوا، نقصان مال وجائداد، بلکہ قتل تک کی تعدیوں کے نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اِس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اِس قسم کی حرکتیں کریں گے، وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی، بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو اُن کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اِس کے برے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔''

(تدبر قرآن ۱/۶۴۰)

[۷۳۴] اصل میں 'فرھان مقبوضۃ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کی خبر کو بھی محذوف قرار دیا جا سکتا ہے اور اِن کو خبر مان کر اِن کا مبتدا بھی محذوف قرار دے سکتے ہیں۔ ہم نے دوسری صورت کو ترجیح دی ہے اور ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

[۷۳۵] اِس سے واضح ہے کہ رہن کی اجازت صرف اُسی وقت تک ہے، جب تک قرض دینے والے کے لیے اطمینان کی صورت پیدا نہیں ہو جاتی۔ اللہ کا حکم ہے کہ یہ صورت پیدا ہو جائے تو رہن رکھی ہوئی چیز لازماً واپس کر دینی چاہیے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

الشَّهَادَةَ، وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ، وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ. ﴿۲۸۳﴾
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ
تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ، فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ، وَاللّٰهُ عَلٰى

کرا لے) اور گواہی (جس صورت میں بھی ہو، اُس) کو ہرگز نہ چھپاؤ اور (یاد رکھو کہ) جو اُسے چھپائے گا، اُس کا دل گناہ گار رہو گا،[۷۳۶] اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔ ۲۸۳

زمین[۷۳۷] اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کا ہے، (اِس لیے تم بھی اے بنی اسرائیل، ایک دن اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) اور جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اُسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ اُس کا حساب تم سے لے گا۔ پھر جس کو چاہے گا، (اپنے قانون کے مطابق) بخش دے گا اور جس کو چاہے گا، سزا دے

”...جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لیے جو باتیں مطلوب ہیں، وہ فراہم ہو جائیں۔ مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے، دستاویز کی تحریر کے لیے کاتب اور گواہ مل گئے، اپنوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اِس امر کے لیے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اُس کو چاہیے کہ وہ رہن کردہ چیز اُس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لیے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے، جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۶۴۳)

[۷۳۶] یعنی یہ ایسا گناہ نہیں ہے جس کا اثر انسان کے محض ظاہری وجود تک ہی رہے۔ یہ لازماً دل میں اترے گا اور اُسے آلودۂ گناہ کرے گا، اِس لیے اِس کو کوئی معمولی چیز سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

[۷۳۷] یہ اِس عظیم سورہ کا خاتمہ ہے جس میں بنی اسرائیل سے اظہار براءت کے بعد ایک بے مثل دعا اِس نئی امت کی زبان پر جاری ہو گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد بنی اسمٰعیل میں سے اٹھائی گئی۔ سورۂ فاتحہ کی طرح خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس کا نزول اِس بات کی بشارت ہے کہ یہ حرف بہ حرف قبول بھی ہو جائے گی۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اِس دعا کے بارے میں لکھتے ہیں:

”اِس کے لفظ لفظ سے اُس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اِس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روحِ ایمان ہے، اُن باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لیے ٹھوکر کا باعث

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ. ﴿٢٨٤﴾

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ، وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، غُفْرَانَكَ رَبَّنَا، وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ. ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، لَهَا مَا كَسَبَتْ

گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ۲۸۴

(تم نہیں مانتے[۷۳۸] تو اِس کا نتیجہ بھی تمھیں ہی دیکھنا ہے)۔ ہمارے پیغمبر نے تو اُس چیز کو مان لیا[۷۳۹] جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر نازل کی گئی ہے، اور اُس کے ماننے والوں نے بھی۔ یہ سب اللہ پر ایمان لائے، اور اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں پر ایمان لائے[۷۴۰]۔ (اِن کا اقرار ہے کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے[۷۴۱] اور اِنھوں نے کہہ دیا ہے کہ ہم نے سنا اور سر اطاعت جھکا دیا[۷۴۲]۔ پروردگار، ہم تیری مغفرت چاہتے ہیں[۷۴۳] اور (جانتے ہیں کہ) ہمیں لوٹ کر

ہوئیں اور ادائے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں، اُن میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں، اُن سے درگذر کی درخواست بھی ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۶۴۵)

[۷۳۸] اِس مضمون کے ساتھ، اگر غور کیجیے تو یہود پر اتمام حجت اور ایک نئی امت کی تاسیس کے بعد بات وہیں پہنچ گئی، جہاں سے شروع ہوئی تھی کہ اِس کتاب سے ہدایت وہی لوگ پائیں گے جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ یہی اِس سورہ کا اصل پیغام ہے اور عود علی البدء کے اسلوب پر قرآن نے خاتمۂ کلام میں ایک مرتبہ پھر اِسے نہایت خوبی کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔

[۷۳۹] اِس سے واضح ہے کہ پیغمبر جس چیز کو لے کر آتا ہے، 'انا اول المؤمنین' کہتے ہوئے سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر اُسے مانتا بھی ہے۔

[۷۴۰] یہ تمام ایمانیات اِس سے پہلے آیت ۱۷۷ کے تحت زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں اِن کا ذکر جس بات کو واضح کرنے کے لیے ہوا ہے، وہ آگے بیان ہو گئی ہے کہ یہ نئی امت خدا کی پوری ہدایت پر ایمان لائی ہے۔ یہود کی طرح اِس کے ایک حصے کو مان کر دوسرے کا انکار نہیں کر رہی ہے۔

[۷۴۱] اِس جملے میں غائب کے صیغے سے یکایک متکلم کی طرف اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے، اُس کا مقصد یہ ہے کہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا، كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا

تیرے ہی حضور میں پہنچنا ہے ــــ (یہ حقیقت ہے کہ) اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ (اُس کا قانون ہے کہ) اُسی کو ملے گا جو اُس نے کمایا ہے اور وہی بھرے گا جو اُس نے کیا ہے[۷۴۴] ــــ پروردگار، ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں تو اُس پر ہماری گرفت نہ کرنا[۷۴۵]۔ اور پروردگار، تو ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلوں پر ڈالا تھا[۷۴۶]۔ اور پروردگار، کوئی ایسا بوجھ نہ ڈال جسے ہم اٹھا نہیں سکتے[۷۴۷]،

بات کو محض خبر کی جگہ سے اٹھا کر اُس میں اعتراف واقرار کا مضمون نمایاں کر دیا جائے۔

[۷۴۲] اِس جملے میں، اگر غور کیجیے تو یہود کے 'سمعنا و عصينا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

[۷۴۳] اصل میں لفظ 'غفرانك' آیا ہے۔ یہ فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اِس موقع پر حذف کا یہ اسلوب دعا کرنے والے کے اضطراب کو نمایاں کرتا ہے اور سمع وطاعت کے اقرار کے معاً بعد یہ دعا بتاتی ہے کہ خدا کی مغفرت کا سہارا نہ ہو تو بندہ اِس دنیا میں اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی ذمہ داری بھی اٹھانے کا حوصلہ نہیں کر سکتا۔

[۷۴۴] دعا کے بیچ میں یہ جملۂ معترضہ تسلی اور بشارت کے لیے ہے کہ جو ذمہ داری اِس نئی امت پر ڈالی جا رہی ہے، وہ اِس کی طاقت سے زیادہ نہیں ہے اور اِس میں ہر شخص کی جزا و سزا اُس کے اپنے ایمان و عمل کے لحاظ سے ہو گی۔ نہ کسی کے اختیار و امکان سے باہر کی چیزوں پر اُس کا مواخذہ کیا جائے گا اور نہ کسی کا ایمان و عمل دوسرے کے لیے نفع و ضرر کا باعث بنے گا۔ ہر شخص جو بوئے گا، وہی کاٹے گا اور جو کرے گا، وہی بھرے گا۔

[۷۴۵] اِس طرح کی بھول چوک اگرچہ معاف ہی ہونی چاہیے، لیکن اِس کے باوجود اِس کے لیے معافی کی درخواست بندوں کی طرف سے غایت درجہ خشیت کو ظاہر کرتی ہے جس سے توقع ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید رحمت و عنایت کے مستحق ہوں گے۔

[۷۴۶] یہ اُن اصر و اغلال کی طرف اشارہ ہے جو یہود کی شریعت میں اُن کی سرکشی کے باعث موجود تھے اور جب وہ اُن کو نہیں اٹھا سکے تو بالآخر اُن کے لیے خدا کا عذاب بن گئے۔

[۷۴۷] یہ استطاعت سے باہر اُن آزمایشوں سے محفوظ رہنے کی درخواست ہے جو بنی اسمٰعیل کو منصب شہادت کی ذمہ داری ادا کرنے کی راہ میں پیش آ سکتی تھیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بِهٖ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا، اَنْتَ مَوْلٰنَا، فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. ﴿٢٨٦﴾

اور ہمیں معاف کر دے اور بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہمارا آقا ہے، اور اِن کافروں[748] کے مقابلے میں (جو ہمارے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں)، ہماری مدد کر۔ ۲۸۵-۲۸۶

---

[۷۴۸] اِس سے مراد وہ منکرین یہود ہیں جو اس طرح اتمام حجت کے باوجود اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح پہچان لینے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے، بلکہ الٹا آپ کی دعوت کے دشمن بن کر مقابلے پر آ گئے۔

—— جاوید احمد غامدی

بدھ، ۲۹ اپریل ۲۰۰۳ء

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نماز فجر اور نماز عصر کا اختتامی وقت

[اس روایت کی ترتیب و تدوین اور شرح و وضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رُوي ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: من ادرك من الصبح[2] ركعة قبل ان تطلع الشمس[3] ثم طلعت الشمس، فقد ادرك الصبح، فليتم صلاته[4]. ومن ادرك ركعة من العصر قبل ان تغرب الشمس[5]، فقد ادرك العصر[6]، فليتم صلاته.

والسجدة انما هی الركعة[7].

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے سورج طلوع ہونے سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت مکمل کر لی[1]، پھر (اس کے باوجود کہ دوران نماز میں) سورج طلوع ہو گیا، اس نے نماز فجر کو پا لیا۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ (اطمینان کے ساتھ) اپنی نماز مکمل کر لے[2]۔ (اسی طرح) جس شخص نے سورج غروب ہونے سے پہلے نماز عصر کی ایک رکعت مکمل کر لی[3] (پھر اس کے باوجود کہ دوران نماز میں

سورج غروب ہو گیا)، اس نے نماز عصر کو پا لیا۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ (اطمینان کے ساتھ) اپنی نماز مکمل کر لے[۴]۔

(یہ واضح رہے کہ) ایک رکعت سجدے ہی پر مکمل ہوتی ہے۔

ترجمے کے حواشی

۱۔ فجر کا اختتامی وقت طلوع آفتاب تک ہے۔

۲۔ یعنی اگر کوئی شخص آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت مکمل کر لے تو اس کی نماز قضا قرار نہیں پائے گی۔

۳۔ عصر کا اختتامی وقت غروب آفتاب تک ہے۔

۴۔ نمازیں اپنے مقررہ اوقات ہی میں ادا ہونی چاہییں۔ ظہر، مغرب اور عشا کے مقابلے میں فجر اور عصر کا اختتامی وقت سورج کے طلوع و غروب سے متعلق ہونے کی وجہ سے بالکل متعین ہوتا ہے۔ ہر شخص بلا اشتباہ اس وقت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اگر سورج نماز کے دوران میں طلوع یا غروب ہو جائے تو کیا نماز مقررہ وقت کے اندر تصور ہو گی یا اسے قضا سمجھا جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں توضیح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص طلوع یا غروب سے پہلے ایک رکعت مکمل کر لے تو اس کی نماز مقررہ وقت کے اندر ادا تصور ہو گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۵۵۴ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۵۳۱۔ مسلم، رقم ۶۰۸۔ ترمذی، رقم ۱۸۶۔ نسائی، رقم ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۵۰، ۵۵۱۔ ابوداؤد، رقم ۴۱۲۔ ابن ماجہ، رقم ۶۹۹، ۷۰۰۔ موطا، رقم ۵۔ دارمی، رقم ۱۲۲۲۔ احمد بن حنبل، رقم ۷۲۱۵، ۷۴۵۳، ۷۵۲۹، ۷۷۸۵، ۸۰۴۲، ۸۵۵۱، ۸۵۶۹، ۹۱۷۲، ۹۹۲۰، ۹۹۵۵، ۱۰۱۳۳، ۱۰۳۴۴، ۱۰۳۶۴، ۱۰۷۶۱، ۲۴۵۳۳۔ ابن حبان، رقم ۱۴۸۴، ۱۵۵۷، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶۔ ابن خزیمہ، رقم ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶۔ نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۴۶۳، ۴۶۴، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵۔ بیہقی، رقم ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳،

۱۶۸۳۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۶۲۸۴۔ ۶۳۰۲، ۶۳۳۲۔

۲۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۶۰۸ میں 'الصبح' کے بجائے 'الفجر' نقل ہوا ہے۔

۳۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۳۱ میں 'من أدرك من الصبح ركعة قبل أن تطلع الشمس' (جس شخص نے سورج طلوع ہونے سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت مکمل کر لی) کے بجائے 'إذا أدرك سجدة من صلاة الصبح قبل أن تطلع الشمس' (جب کوئی طلوع آفتاب سے پہلے صبح کی نماز کا ایک سجدہ مکمل کر لیتا ہے) کے الفاظ آئے ہیں۔ نسائی، رقم ۵۱۶ میں 'إدرك سجدة ...' (جب کوئی سجدہ مکمل کر لیتا ہے ...) کا جملہ اس طریقے سے نقل ہوا ہے: 'إذا أدرك اول سجدة من ...' (جب کوئی پہلا سجدہ مکمل کر لیتا ہے ...)۔ احمد بن حنبل، رقم ۸۰۴۲ میں یہی بات قدرے مختلف اسلوب میں بیان ہوئی ہے۔ اس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلى ركعة من الصبح ثم طلعت الشمس فليتم صلاته.

''جس شخص نے فجر کی ایک رکعت پڑھی پھر (دوران نماز ہی میں) سورج طلوع ہو گیا، اسے چاہیے کہ وہ اپنی نماز مکمل کر لے۔''

اس روایت میں 'ثم طلعت الشمس' (پھر سورج طلوع ہو گیا) کے الفاظ آئے ہیں۔ بخاری، رقم ۱۶۵۲ میں یہی بات 'فطلعت' (پھر وہ طلوع ہو گیا) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

مسلم، رقم ۶۰۸ میں یہ روایت بعض الفاظ کے اضافے کے ساتھ نقل ہوئی ہے:

روي انه قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من ادرك من العصر سجدة قبل ان تغرب الشمس او من الصبح قبل ان تطلع فقد ادركها، والسجدة انما هي الركعة.

''روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کا یا طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر کا ایک سجدہ پالیا، تو اس نے (نماز) کو پالیا۔ (واضح رہے کہ) سجدے ہی پر ایک رکعت مکمل ہوتی ہے۔''

نسائی، رقم ۵۱۴ میں اس سے قدرے مختلف بات بیان ہوئی ہے۔ اس روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من ادرك ركعتين من صلاة العصر قبل ان تغرب الشمس او ركعة من صلاة الصبح قبل ان تطلع الشمس فقد ادرك.

''جس شخص نے غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کی دو رکعتیں مکمل کیں یا طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت مکمل کی تو اس نے اس (نماز) کو پالیا۔''

یہ روایت اس فرق کے ساتھ احمد بن حنبل، رقم ۸۵۶۹، ۹۹۲۰، ابن خزیمہ، رقم ۹۸۴، نسائی سنن الکبریٰ، رقم ۱۵۳۴، مسند ابو یعلیٰ، رقم ۶۳۰۲ میں بھی نقل ہوئی ہے۔ اس فرق کا سبب بظاہر راوی کا سہو معلوم ہوتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نسائی سنن الکبریٰ میں 'قبل ان تطلع الشمس' (اس سے پہلے کہ سورج طلوع ہو) کے الفاظ کی جگہ 'قبل ان يطلع قرن الشمس الاول' (سورج کی پہلی کرن ظاہر ہونے سے پہلے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۴۔ 'فليتم صلاته' (تو اسے چاہیے کہ اپنی نماز مکمل کرلے) کے الفاظ بخاری، رقم ۵۳۱ سے لیے گئے ہیں۔ احمد بن حنبل، رقم ۸۵۵۱ میں اس کے بجائے 'فليصل اليها اخرى' (اسے چاہیے کہ باقی نماز مکمل کرلے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ جبکہ احمد بن حنبل، رقم ۷۲۱۵ میں یہی بات 'فصل عليها اخرى' (تجھے چاہیے کہ نماز کا باقی حصہ مکمل کرلے) کے اسلوب میں بیان ہوئی ہے۔

۵۔ ابن حبان، رقم ۱۴۴۸ میں 'فقد ادرك الصبح' (تو اس نے صبح کی نماز پالی) اور 'فقد ادرك العصر' (اس نے عصر کو پالیا)، کے بجائے 'لم تفته الصلاة' (اس کی نماز قضا نہیں ہوئی) کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

۶۔ نسائی، رقم ۵۱۵ میں 'قبل ان تغرب الشمس' (اس سے پہلے کہ سورج غروب ہو) کے بجائے 'قبل ان تغيب الشمس' (اس سے پہلے کہ سورج غائب ہو) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۷۔ 'والسجدة انما هى الركعة' (سجدے ہی پر ایک رکعت مکمل ہوتی ہے) کے الفاظ مسلم، رقم ۶۰۸ سے لیے گئے ہیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

تقدیر اور شک وشبہ

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث:۱۱۴)

عن عائشة رضی اللّٰه عنها، قالت: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یقول: من تکلم فی شیء من القدر سئل عنه یوم القیامة، ومن لم یتکلم فیه لم یسأل عنه.

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ جس نے تقدیر کے بارے میں کوئی شک ظاہر کیا، اس سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا اور جس نے کوئی شک شبہ ظاہر نہیں کیا، اس سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

من تکلم فی شیء من القدر: جس نے قدر کے کسی پہلو کے بارے میں بات کی۔ لیکن سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہاں اس سے مراد تقدیر کے بارے میں شکوک وشبہات ظاہر کرنا ہے۔

سئل عنه: اس سے پوچھا گیا۔ یہ اگرچہ ماضی کا جملہ ہے، لیکن چونکہ قیامت سے متعلق ہے، اس لیے اس کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ اس سے مراد مخاطب کو تنبیہ ہے اور اس بات کی آگاہی ہے کہ اس کو قیامت کے دن اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔

متون

یہ روایت ابن ماجہ نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے اور وہیں سے اسے صاحب مشکوٰۃ نے اپنی کتاب کے لیے اقتباس کی

ہے۔اس روایت کا ایک ہی دوسرا متن ہے اوراس میں اس روایت کا صرف پہلا جملہ منقول ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'لا یسئل عنه' والا جملہ نہ بولا ہو۔اس لیے کہ یہ محض پہلے جملے کا صریح نتیجہ جو بیان ہو گیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عام اسلوب جوامع الکلم کا ہے اوراس اسلوب میں اس طرح کی تصریحات کی ضرورت نہیں ہوتی۔البانی مرحوم کی تحقیق کے مطابق اس کی سند ضعیف ہے۔

معنی

تقدیر کیا ہے؟ یہ درحقیقت اس حقیقت کا ادراک ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق چل رہی ہے۔بطور خاص انسان جسے آزمایش میں ڈالا گیا ہے کہ زندگی میں جبر اور اختیار پہلو بہ پہلو قائم ہیں۔مزید برآں یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ایک خود کار نظام ضرور بنایا ہے، لیکن وہ اس سے غیر متعلق نہیں ہے۔ وہ کائنات اور انسانی زندگی میں پوری طرح متصرف ہے۔ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ انسان کو چونکہ خیر وشر کی آزمایش میں ڈالا گیا ہے، اس لیے اس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے اس کے کسی قول وفعل پر کوئی ایسی قدغن عائد نہیں کی جو اس آزمایش کے عادلانہ ہونے کی نفی کرتی ہو۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کائنات کا خالق و مالک ہی نہ مانا جائے، بلکہ اسے اس کا ایک متصرف حاکم بھی مانا جائے جس نے انسان کو آزمایش کے لیے ایک دائرے میں آزادی دے رکھی ہے۔

یہ روایت بتاتی ہے کہ آزادی اور جبر کی اس حالت کی جزیات کو طے کرنا اپنی حدود سے تجاوز ہے۔خطرہ یہ ہے کہ ایسا انسان راہ صواب سے ہٹ جائے گا۔چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اس معاملے میں اصولی ایمان پر اکتفا کرنا چاہیے اور تفصیلات کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ قیامت کے دن اپنے قول وفعل کا ذمہ دار ہوگا۔اور خاموشی اختیار کرنے والا عافیت میں رہے گا۔

شارحین نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ اس روایت میں تقدیر کے بارے میں سوال پر تنبیہ کی گئی ہے اور تقدیر کے بارے میں خاموشی کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔صاحب مرقاۃ نے اس روایت کی وضاحت کرتے ہوئے یہ نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ ہم تقدیر پر ایمان کے مکلّف ہیں، اس کے عقلی ونقلی دلائل پر تفحص ہم پر لازم نہیں ہے۔ یہ نکتہ ایک پہلو سے اپنے اندر ایک صحت رکھتا ہے۔لیکن اسے اس روایت میں متکلم کا منشا قرار دینے میں ایک تکلف محسوس ہوتا ہے۔

کتابیات

ابن ماجہ، رقم ۸۱، مسند الحارث (زوائد الہیثمی)، رقم ۷۴۴۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نماز کے اوقات

نماز مسلمانوں پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔ یہ اوقات درج ذیل ہیں:

فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشا۔

صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے الگ ہو جائے تو یہ فجر ہے۔

ظہر سورج کے نصف النہار سے ڈھلنے کا وقت ہے۔

سورج مرأی العین سے نیچے آجائے تو یہ عصر ہے۔

سورج کے غروب ہو جانے کا وقت مغرب ہے۔

شفق کی سرخی ختم ہو جائے تو یہ عشا ہے۔

فجر کا وقت طلوع آفتاب تک؛ ظہر کا عصر، عصر کا مغرب، مغرب کا عشا اور عشا کا وقت آدھی رات تک ہے۔ سورج کے زمانۂ پرستش میں طلوع و غروب کے وقت اس کی عبادت کے باعث یہ دونوں وقت نماز کے لیے ممنوع قرار دیے گئے ہیں۔ نماز کے اعمال و اذکار کی طرح اس کے یہ اوقات بھی اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہیں۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انبیا علیہم السلام کے دین میں نماز کے اوقات ہمیشہ یہی رہے ہیں۔ قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر انھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ، وَزُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ، ذٰلِكَ ذِكۡرٰى لِلذّٰكِرِيۡنَ. (ہود۱۱:۱۱۴)

''اور دن کے دونوں حصوں میں نماز کا اہتمام کرو، اور رات کے کچھ حصے میں بھی، اس لیے کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے لیے یاددہانی ہے جو یاددہانی حاصل کرنا چاہیں۔''

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ، اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا، وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡبِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، عَسٰۤى اَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸۔۷۹)

''سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کے تاریک ہو جانے تک نماز کا اہتمام کرو اور بالخصوص فجر کی قرأت کا، اس لیے کہ فجر کی قرأت روبرو ہوتی ہے۔ اور رات میں بھی کچھ دیر کے لیے اسی طرح اٹھو (اور نماز پڑھو)۔ یہ تمھارے لیے مزید براں ہے۔ اس سے توقع ہے کہ تمھارا رب تمھیں (قیامت کے دن) اس طرح اٹھائے کہ تم ممدوح خلائق ہو۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِهَا، وَمِنۡ اٰنَآئِ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡ، وَاَطۡرَافَ النَّهَارِ، لَعَلَّكَ تَرۡضٰى. (طٰہٰ ۲۰:۱۳۰)

''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو سورج کے طلوع و غروب سے پہلے، اور (اسی طرح) رات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔''

فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ، وَحِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ، وَلَهُ الۡحَمۡدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ، وَعَشِيًّا وَّ حِيۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ. (الروم ۳۰:۱۷۔۱۸)

''اللہ کی تسبیح کرو جب تم شام کرتے اور جب صبح کرتے ہو، اور (جان رکھو کہ) زمین و آسمان میں اُسی کی حمد ہو رہی ہے، اور عشا کے وقت بھی (تسبیح کرو) اور اُس وقت بھی جب ظہر ہوتی ہے۔''

وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ الۡغُرُوۡبِ، وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ، وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ. (ق ۵۰:۳۹۔۴۰)

''اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرو، سورج کے طلوع و غروب سے پہلے، اور رات کے کچھ حصے میں بھی اُس کی تسبیح کرو، اور سورج کی سجدہ ریزیوں کے بعد بھی۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل سے جو رہنمائی اس باب میں حاصل ہوتی ہے، اس کی تفصیلات یہ ہیں:

۱۔ فجر کی نماز آپ بالعموم اندھیرے ہی میں پڑھ لیتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ عورتیں نماز پڑھ کر چادروں میں لپٹی ہوئی لوٹتیں تو پہچانی نہیں جاتی تھیں۔[۱۷۶]

۱۷۶؎ بخاری، رقم ۵۵۳۔

۲۔ظہر کی نماز عین نصف النہار کے وقت پڑھنے سے آپ نے منع کیا اور فرمایا ہے کہ یہ وقت جہنم کے دہکانے کا ہے[۱۷۷]۔ اس نماز کے متعلق آپ کا عام طریقہ یہ تھا کہ گرمی کے موسم میں اسے ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے[۱۷۸]۔

۳۔عصر کی نماز اس وقت پڑھتے ، جب سورج بلندی پر اور پوری طرح روشن ہوتا تھا[۱۷۹]۔فرماتے تھے: یہ منافق کی نماز ہے کہ سورج کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے۔ پھر جب وہ زرد ہو جاتا ہے اور شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان میں آجاتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتا ہے، اور اپنی اس نماز میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے[۱۸۰]۔

۴۔مغرب کی نماز جلدی پڑھتے اور عشا میں تاخیر کو پسند فرماتے تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ عشا سے پہلے سونا اور اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کرنا آپ کو پسند نہیں تھا[۱۸۱]۔

۵۔نماز کا وقت ختم ہونے سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی جائے تو آپ کا ارشاد ہے کہ اسے پورا کر لیا جائے، اس سے نماز ادا ہو جائے گی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ جس نے سورج نکلنے سے پہلے فجر کی ایک رکعت اور اس کے غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی، اسے مطمئن رہنا چاہیے کہ اس نے یہ نمازیں پالی ہیں[۱۸۲]۔اسی طرح فرمایا ہے کہ سو جانے میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ہاں، کوئی شخص جاگتے ہوئے نماز چھوڑ دے تو یقیناً قصوروار ہے۔ لہٰذا تم میں سے اگر کوئی نماز پڑھنا بھول جائے یا نماز کے وقت سوتا رہ جائے تو اسے چاہیے کہ متنبہ ہوتے ہی نماز ادا کر لے[۱۸۳]۔

۶۔تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نماز بغیر کسی عذر کے بالکل آخری وقت تک موخر کر دی جائے۔ روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ جبریل امین نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو دن نماز پڑھائی اور فرمایا کہ انبیا علیہم السلام کی نماز کا وقت انھی دو وقتوں کے درمیان میں ہے تو فجر کو اسفار سے، عشا کو ایک تہائی رات سے، مغرب کو روزہ کھولنے کے وقت سے، ظہر وعصر کو اس سے زیادہ موخر نہیں کیا کہ کسی شخص کا سایہ نماز ظہر کے وقت اس کے برابر اور عصر کے وقت اس سے دو گنا ہو جائے[۱۸۴]۔ یہی

۱۷۷؎ مسلم، رقم ۸۳۲۔

۱۷۸؎ بخاری، رقم ۵۱۱۔

۱۷۹؎ بخاری، رقم ۵۲۵۔

۱۸۰؎ مسلم، رقم ۶۲۲۔

۱۸۱؎ ابوداؤد، رقم ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۲۲۔ ترمذی، رقم ۱۶۷۔ بخاری، رقم ۵۲۲۔

۱۸۲؎ بخاری، رقم ۵۵۴۔

۱۸۳؎ مسلم، رقم ۶۸۱، ۶۸۴۔

معاملہ اس وقت بھی ہوا جب کسی شخص کو آپ نے دو دن اپنے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے کہا اور دوسرے دن کی نمازوں کے بعد فرمایا: نماز کا وقت انھی دو وقتوں کے درمیان میں ہے جو تم نے دیکھ لیے ہیں۔ اس موقع پر نماز مغرب، البتہ دوسرے دن اس کے آخری وقت سے ذرا پہلے پڑھی گئی۔[۱۸۵]

۷۔ نماز کے لیے ممنوع اوقات کے متعلق آپ نے غایت درجہ احتیاط کی تلقین کی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ نماز فجر کے بعد سورج کے طلوع ہو جانے اور نماز عصر کے بعد اس کے غروب ہو جانے تک کوئی نماز نہ پڑھی جائے۔[۱۸۶]

۸۔ مسلمانوں کا کوئی حکمران نماز میں تاخیر کرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ لوگ اپنے طور پر نماز پڑھ لیں اور پھر اس کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائیں۔[۱۸۷]

نماز کی رکعتیں

نماز کے لیے جو رکعتیں شریعت میں مقرر کی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

فجر: ۲ رکعت

ظہر: ۴ رکعت

عصر: ۴ رکعت

مغرب: ۳ رکعت

عشا: ۴ رکعت

نماز کی فرض رکعتیں یہی ہیں جن کے چھوڑنے پر قیامت میں مواخذہ ہو گا۔ چنانچہ ان صورتوں کے سوا جن میں قصر کی اجازت دی گئی ہے، یہ لازماً پڑھی جائیں گی۔ ان کے علاوہ باقی سب نمازیں نفل ہیں جن کا پڑھنا باعث اجر ہے، لیکن ان کے چھوڑ دینے پر اللہ کی طرف سے کسی مواخذے کا اندیشہ نہیں ہے۔

نماز میں رعایت

نماز کا وقت کسی خطرے کی حالت میں آ جائے تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ پیدل چلتے ہوئے یا سواری پر، جس

۱۸۴؎ ابوداؤد، رقم ۴۱۶۔

۱۸۵؎ مسلم رقم ۶۱۳۔

۱۸۶؎ بخاری، رقم ۵۶۱۔ مسلم، رقم ۸۲۶۔

۱۸۷؎ مسلم، رقم ۶۴۸۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طرح ممکن ہو، نماز پڑھ لی جائے۔ اس میں، ظاہر ہے کہ جماعت کا اہتمام نہیں ہوگا، قبلہ رو ہونے کی پابندی بھی برقرار نہ رہے گی اور نماز کے اعمال بھی بعض صورتوں میں ان کے لیے مقرر کردہ طریقے پر ادا نہ ہو سکیں گے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا، فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ، كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ ۲: ۲۳۹)

’’پھر اگر خطرے کا موقع ہو تو پیدل یا سواری پر، جس طرح چاہے، پڑھ لو۔ لیکن جب امن ہو جائے تو اللہ کو اسی طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمھیں سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے تھے۔‘‘

اس طرح کی صورت حال کسی سفر میں پیش آجائے تو قرآن نے مزید فرمایا ہے کہ لوگ نماز میں کمی بھی کر سکتے ہیں۔ اصطلاح میں اسے قصر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے یہ سنت قائم کی ہے کہ صرف چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی۔ دو اور تین رکعت والی نمازوں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ چنانچہ فجر اور مغرب کی نمازیں اس طرح کے موقعوں پر بھی پوری پڑھیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فجر پہلے ہی دو رکعت ہے اور مغرب دن کے وتر ہیں، ان کی یہ حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سورۂ نساء میں یہ حکم اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ، فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ، اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا. (۴: ۱۰۱)

’’اور جب تم سفر میں نکلو تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ نماز میں قصر کر لو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں آزمایش میں ڈال دیں گے۔ اس لیے کہ یہ منکر تمھارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔‘‘

نماز میں کمی کرنے اور اسے چلتے ہوئے یا سواری پر پڑھ لینے کی یہ رخصتیں یہاں ’خفتم‘ کی شرط کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے عام سفروں کی پریشانی، افراتفری اور آپادھاپی کو بھی اس پر قیاس فرمایا اور ان میں بالعموم قصر نماز ہی پڑھی ہے۔ اسی طرح قافلے کو رکنے کی زحمت سے بچانے کے لیے نفل نمازیں بھی سواری پر بیٹھے ہوئے پڑھ لی ہیں۔[۱۸۸] سیدنا عمر کا بیان ہے کہ اس طرح نماز قصر کر لینے پر مجھے تعجب ہوا۔ چنانچہ میں نے پوچھا تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ کی عنایت ہے جو اس نے تم پر کی ہے، سو اللہ کی اس عنایت کو قبول کرو۔[۱۸۹]

نماز میں تخفیف کی اس اجازت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اوقات میں تخفیف کا استنباط بھی کیا ہے اور اس

۱۸۸؎ بخاری، رقم ۱۰۴۲۔ مسلم، رقم ۷۰۱۔

۱۸۹؎ مسلم، رقم ۶۸۶۔ اس جواب سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس استنباط کی تصویب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ہو گئی تھی۔

طرح کے سفروں میں ظہر، عصر، اور مغرب اور عشا کی نمازیں جمع کر کے پڑھائی ہیں۔ سیدنا معاذ بن جبل کی روایت ہے کہ غزوۂ تبوک کے سفر میں آپ کا طریقہ بالعموم یہ رہا کہ اگر سورج کوچ سے پہلے ڈھل جاتا تو ظہر و عصر کو جمع کر لیتے اور اگر سورج کے ڈھلنے سے پہلے کوچ کرتے تو عصر کے لیے اترنے تک ظہر کو موخر کر لیتے تھے۔ مغرب کی نماز میں بھی یہی صورت ہوتی۔ سورج کوچ سے پہلے غروب ہو جاتا تو مغرب اور عشا کو جمع کرتے اور اگر سورج غروب ہونے سے پہلے کوچ کرتے تو عشا کے لیے اترنے تک مغرب کو موخر کر لیتے اور پھر دونوں نمازیں جمع کر کے پڑھتے تھے۔[190]

یہی معاملہ حج کے موقع پر بھی ہوا۔ اس میں چونکہ شیطان کے خلاف جنگ کو علامتوں کی زبان میں ممثل کیا جاتا ہے، اس لیے تمثیل کے تقاضے سے آپ نے یہ سنت قائم فرمائی کہ لوگ مقیم ہوں یا مسافر، وہ منیٰ میں قصر اور مزدلفہ عرفات میں جمع اور قصر، دونوں کریں گے۔

اس استنباط کا اشارہ خود قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ نساء میں یہ حکم جس آیت پر ختم ہوا ہے، اس میں 'ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً' کے الفاظ عربیت کی رو سے تقاضا کرتے ہیں کہ ان سے پہلے 'اور وقت کی پابندی کرو' یا اس طرح کوئی جملہ مقدر سمجھا جائے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوتی ہے کہ قصر کی اجازت کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ نماز کی رکعتوں کے ساتھ اس کے اوقات میں بھی کمی کر لیں۔ چنانچہ ہدایت کی گئی کہ جب اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز پڑھو اور اس کے لیے مقرر کردہ وقت کی پابندی کرو، اس لیے کہ نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات ایک مشکل یہ بھی تھی کہ میدان جنگ میں نماز کی جماعت کھڑی کی جائے اور حضور امامت کرائیں تو کوئی مسلمان اس جماعت کی شرکت سے محروم رہنے پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر سپاہی کی یہ آرزو ہوتی کہ وہ آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کرے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی، لیکن اس کے ساتھ دفاع کا اہتمام بھی ضروری تھا۔ اس مشکل کا ایک حل تو یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود چار رکعتیں پڑھتے اور اہل لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو کر دو دو رکعتوں میں آپ کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ بعض موقعوں پر یہ طریقہ اختیار کیا بھی گیا،[191] لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں جو زحمت ہو سکتی تھی، اس کے پیش نظر قرآن نے یہ تدبیر بتائی کہ امام اور مقتدی، دونوں قصر نماز ہی پڑھیں، اور لشکر کے دونوں حصے یکے بعد دیگرے آپ کے ساتھ آدھی نماز میں شامل ہوں اور آدھی نماز اپنے طور پر ادا کر لیں۔ چنانچہ ایک حصہ

190؎ ابوداؤد، رقم ۱۲۲۰۔

191؎ مسلم، رقم ۸۴۳۔

پہلی رکعت کے سجدوں کے بعد پیچھے ہٹ کر حفاظت ونگرانی کا کام سنبھالے اور دوسرا حصہ، جس نے نماز نہیں پڑھی ہے، آپ کے پیچھے آ کر دوسری رکعت میں شامل ہو جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ، فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ، وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ، فَاِذَا سَجَدُوْا، فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ، وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا، فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ، وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ. وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً، وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ، وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ، اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا. فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ، فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا. (النساء۴: ۱۰۲۔۱۰۳)

''اور (اے پیغمبر)، جب تم ان کے درمیان ہو اور (میدان جنگ) میں انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا رہے اور اپنا اسلحہ لیے رہے۔ پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمھارے پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آئے، جس نے نماز نہیں پڑھی ہے اور تمھارے ساتھ نماز ادا کرے۔ اور یہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنا اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔ یہ منکر تو چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور سامان سے ذرا غافل ہو تو تم پر یک بارگی ٹوٹ پڑیں۔ اس بات میں، البتہ کوئی حرج نہیں ہے کہ اگر بارش کی تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنا اسلحہ اتار دو۔ ہاں، یہ ضروری ہے کہ حفاظت کا سامان لیے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ نے ان منکروں کے لیے بڑی ذلت کی سزا مہیا کر رکھی ہے۔ اس طریقے سے جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے، (ہر حال میں) یاد کرتے رہو۔ پھر جب اطمینان میں ہو جاؤ تو پوری نماز پڑھو (اور اس کے لیے مقرر کردہ وقت کی پابندی کرو)، اس لیے کہ نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔''

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی رو سے لشکر کو جو رکعت اپنے طور پر ادا کرنا تھی، اس کے لیے حالات کے لحاظ سے مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توقف فرمایا اور لوگ نماز پوری کر کے پیچھے ہٹے[۱۹۲] اور ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے بعد میں نماز پوری کر لی۔[۱۹۳] اس کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت اب باقی نہیں رہی۔ اس کی وجہ یہ

۱۹۲؎ بخاری، رقم ۳۹۰۰۔ مسلم، رقم ۸۴۲۔

۱۹۳؎ بخاری، رقم ۹۰۰۔ مسلم، رقم ۸۳۹۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہے کہ اس تدبیر کا تعلق، جیسا کہ آیت میں 'و اذا کنت فیھم' کے الفاظ سے واضح ہے، خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ آپ کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتدا کی خواہش نہ اتنی شدید ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اتنی اہمیت ہے۔ قیام جماعت کا موقع ہو تو لوگ اب الگ الگ اماموں کے اقتدا میں نہایت آسانی کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ریحان احمد یوسفی

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

ایک زمانہ تھا کہ عام مسلمان قرآن سے بالکل بے نیاز ہوا کرتے تھے۔ گھروں میں قرآن بس تبرک کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ اس کے ترجمے کا رواج نہ تھا۔ چنانچہ عربی زبان سے ناواقف لوگوں کے لیے اسے سمجھنے کا کوئی سوال نہ تھا۔ عوام الناس میں سے زیادہ نیک لوگ ثواب حاصل کرنے کی غرض سے بلا سمجھے اسے پڑھا کرتے تھے، جبکہ دیگر لوگ بالعموم مردوں کو بخشوانے اور دلہنوں کو قرآن کے سائے میں رخصت کرنے کے لیے اسے استعمال کیا کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کے خاندان کی کوششوں سے ہمارے ہاں قرآن کو ایک مختلف حیثیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ علما میں قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کا چلن عام ہوا۔ ان کے کیے ہوئے ترجمے گھروں میں رکھے اور پڑھے جانے لگے۔ آہستہ آہستہ قرآن فہمی کی تحریکیں اٹھیں۔ معاشرہ میں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا رویہ عام ہوا۔ گو ابھی بھی عوام کی اکثریت قرآن سے لاتعلق ہے، مگر ایک بڑی تعداد میں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا ذوق پیدا ہو چکا ہے۔ لوگ اس مقصد کے لیے مختلف تفاسیر پڑھتے اور علما سے رجوع کرتے ہیں۔ اس ذوق کا خصوصی اظہار رمضان المبارک میں ہوتا ہے جب تراویح کے علاوہ بڑی تعداد میں قرآن فہمی کی محافل کا انعقاد کیا جاتا ہے اور میڈیا پر نشر ہونے والے پروگراموں سے لوگوں کی بڑی تعداد استفادہ کرتی ہے۔

یہ سب کچھ بہت قابل تحسین ہے۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس پورے عمل میں لوگوں تک قرآن کا وہ پیغام نہیں پہنچ پارہا جس کے لیے اسے نازل کیا گیا ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں، مگر یہ چونکہ ایک علمی موضوع ہے، اس لیے سر دست ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اپنی اس تحریر میں ہم کوشش کریں گے کہ قرآن کا وہ پیغام لوگوں کے سامنے لائیں جس کے لیے اصلاً اسے نازل کیا گیا ہے، مگر اس دور میں بہت حد تک اس سے پہلو تہی کی گئی ہے یا پھر اسے ایک ثانوی درجہ کی چیز قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآنی مضامین اور ان کے مقاصد کا ایک اجمالی جائزہ بھی اس تحریر میں قارئین کے سامنے آجائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن کا اصل پیغام کیا ہے؟

قرآنی ہدایت کا بنیادی پیغام انسانوں کو ان کے بارے میں خدا کے منصوبے سے آگاہ کرنا ہے۔ قرآن ہمیں صراحت سے یہ بتاتا ہے کہ انسان اس دنیا میں خود بخود نہیں آیا، بلکہ کائنات کے خالق نے اسے یہاں ایک مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ یہ مقصد انسان کی آزمایش اور اس آزمایش کے نتائج کی بنیاد پر اس کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ دوران آزمایش میں ہر انسان کو اس دنیا میں ایک خاص مدت تک مہلت عمل دی جاتی ہے جس میں اسے اپنے آپ کو غلط عقائد اور برے اعمال کی ہر گندگی سے بچا کر رکھنا ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں اس کے پاس پورا اختیار اور تمام مواقع دستیاب ہوتے ہیں کہ وہ اچھا یا برا، جیسا دل چاہے عمل کرے، وہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا بدی کی، وہ خدا کی عبادت کرے یا شیطان کی، وہ توحید کی راہ پر چلے یا شرک کی، وہ پاک نفس رہے یا آلایش پسند بنے۔ لیکن جیسے ہی اس کی مہلت عمل ختم ہوتی ہے، اس پر موت وارد کر دی جاتی ہے۔ ایک روز یہی موت پوری دنیا پر طاری کر دی جائے گی اور پھر ایک نئی دنیا بسائی جائے گی۔ اس روز تمام انسانوں کو اٹھایا جائے گا اور ان سے ان کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا اور گناہوں سے لتھڑے ہوئے رب کے حضور پیش ہوئے، ان کا انجام جہنم ہو گا اور جو پاکیزہ اعمال لے کر پہنچے ان کا بدلہ ابدی جنت ہو گا۔

ایسا نہیں ہے کہ قرآن نے پہلی دفعہ آ کر لوگوں کو خدا کے اس پیغام سے آگاہ کیا اور اس سے قبل انسانیت اس بات سے بالکل بے خبر تھی۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی پہلی نہیں، آخری کتاب ہے۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پہلے نہیں، بلکہ آخری نبی ہیں۔ ان سے قبل بھی ہر دور میں خدا کے پیغمبر انسانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ لہٰذا پچھلے انبیا و رسل اور کتب و ادیان کے ذریعے سے لوگ بالعموم ان تصورات سے آگاہ تھے، مگر مسئلہ یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے مفادات، خیالات اور شیطانی ترغیبات کے زیر اثر پچھلی رہنمائی کو مسخ کر ڈالا اور گم راہی کا راستہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ توحید کے ساتھ شرک کی آمیزش کر دی گئی۔ آخرت کی جواب دہی کو شفاعت کے غلط تصورات کے ذریعے سے غیر موثر کر دیا گیا۔ کبھی شریعت کو منسوخ کر دیا گیا تو کبھی خود کو رب کا چہیتا قرار دے دیا گیا۔ کہیں دینی اعمال میں بدعات داخل کی گئیں تو کہیں نسلی تعلق کو اخروی نجات کے لیے کافی سمجھا گیا۔

چنانچہ جب قرآن نازل ہوا تو اس کا زیادہ تر زور ان گم راہیوں اور بدعملیوں کی بیخ کنی پر رہا جو مذہب اور ہدایت کے نام پر رواج پا گئی تھیں۔ بالخصوص شرک قرآن کا نشانہ بنا۔ کیونکہ یہ عقیدہ نہ صرف سب سے بڑی گم راہی ہے، بلکہ عقیدہ و عمل کی دیگر خرابیوں کی راہ بھی یہی سے کھلتی ہے۔ صرف ایک خدا پر ایمان کے ساتھ آخرت میں اس کے حضور جواب دہی کے تصور کو، جو بڑی حد تک مردہ ہو چکا تھا، قرآن نے پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ انھیں ایک روز اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ جہاں اس کے نافرمان بدعمل اور بدعقیدہ لوگوں کو جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ اس لیے لوگوں کو تنہا اللہ کی عبادت کرنی چاہیے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا چاہیے تاکہ وہ جنت کی ابدی کامیابی حاصل کر سکیں۔ قرآن اپنے اس تصور فلاح و نجات کے دلائل دیتا ہے۔ اس بارے میں لوگوں کی ہر غلط فہمی کو دور کرتا ہے۔ ان کے ہر شبہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا جواب دیتا ہے۔ان کے باطل تصورات کی نفی کرتا ہے۔ جولوگ اس کی دعوت کے منکر ہیں، انھیں قیامت کے برے انجام سے ڈراتا اور ماننے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتا ہے۔غرض توحید اور آخرت کے اپنے اس بنیادی پیغام کی وضاحت میں قرآن بڑی تفصیل سے کام لیتا ہے اور اس کا کوئی ادنیٰ سا گوشہ بھی لوگوں کے لیے مبہم نہیں چھوڑتا۔

شریعت: خدا کی صراط مستقیم

قرآن کا اکثر حصہ اسی دعوت کی تفصیل پر مشتمل ہے جو ہم نے اوپر بیان کی۔ جولوگ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت پر ایمان لے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے عقائد کی اصلاح کے بعد برے اعمال کی گندگی سے نکلنے کا راستہ بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انھیں اس صراط مستقیم سے نوازتے ہیں جسے ہم شریعت کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ پاکیزہ شریعت نفس انسانی کا تزکیہ کرتی ہے۔مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی کی عمارت اسی کی بنیاد پر استوار کریں۔ یہ دنیا اور آخرت میں کامیابی کا وہ راستہ ہے جس تک انسان اپنی عقل وبصیرت سے کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ یہ شریعت بندوں کے لیے خدا کا عظیم تحفہ ہے۔قرآنی مضامین کا دوسرا حصہ اسی شریعت کے بیان پر مشتمل ہے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ پہلے نبی اور قرآن پہلی کتاب نہیں ہے۔اسی طرح اسلامی شریعت بھی پہلی شریعت نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ اس سے قبل بھی اپنے بندوں کو نجات کا عملی راستہ بتاتے رہے ہیں، مگر عقائد کی طرح اعمال میں بھی لوگوں نے تحریفات اور بدعات کا دروازہ کھول دیا تھا۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شریعت ہمیں دی ہے، وہ بالکل نئی چیز نہیں ہے۔اسلام کے سارے اعمال اور شریعت اسلامی کے بیش تر اجزا پہلے سے موجود رہے ہیں۔نماز، روزہ، حج، قربانی، زکوٰۃ میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو قرآن نے پہلی دفعہ متعارف کرائی ہو اور اس سے قبل لوگ ان سے واقف نہ ہوں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن ان اعمال کی تاکید تو بہت کرتا ہے، مگر تفصیل نہیں بتاتا۔وہ انھیں اعمال صالحہ کے لازمی اجزا میں سے گنواتا ہے، مگر ان کی شرح وضاحت نہیں کرتا۔ وہ صرف ان کی اہمیت بیان کر کے، ان سے متعلق کچھ اصولی باتیں بیان کر کے ان کی تفصیلات، جو زیادہ تر عملی نوعیت کی ہوتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیتا ہے، جو اللہ کی ہدایت کی روشنی میں ان معاملات میں لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ شریعت اسلامی کا وہ پہلو ہے جس کا قرآن میں تذکرہ تو بہت ہے، مگر اصلاً یہ رسول اللہ کی سنت متواترہ کے طور پر امت کے اجتماعی عمل کے ذریعے سے آگے منتقل ہوا ہے۔ان کا اصل ماخذ اور تفصیلات اصلاً سنت ثابتہ میں ہیں، قرآن میں ان کا تذکرہ محض تاکید کے پہلو سے آیا ہے۔لیکن بہر حال قرآن کا ایک بڑا حصہ انھی تاکیدی بیانات پر مشتمل ہے۔ یہاں سنت ثابتہ کا ذکر آ گیا ہے تو ہم یہ واضح کرتے چلیں کہ تمام تر شریعت کا ماخذ قرآن نہیں ہے، بلکہ شریعت کا ایک بڑا حصہ صرف اس سنت کے ذریعے سے ہمیں ملا ہے مثلاً ختنہ وغیرہ وہ چیزیں ہیں کہ قرآن جن کے ذکر سے خالی ہے، مگر وہ شریعت کا حصہ ہیں۔

شریعت اسلامی کا دوسرا پہلو جو اصلاً قرآن میں مذکور ہے، وہ قوانین ہیں جن کا تعلق ہماری زندگی کے عملی گوشوں سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔ یہ قوانین فرد واجتماع کی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں کے بارے میں ہمیں اصولی رہنمائی دیتے ہیں۔ ہمارا خاندانی نظام کن اصولوں پر استوار ہونا چاہیے، معاشرت کی اساس کیا ہونی چاہیے، معاشی نظام کن بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے، کھانے پینے کے حدود کیا ہیں، سیاست اور جنگ کے اصول کیا ہیں، قرآن ان سب کی تفصیل بیان کرتا اور ان امور کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے۔ اعمال کے برخلاف یہی وہ چیزیں ہیں، قرآن جن کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ اور بعض اوقات تو انتہائی جزیات میں جا کر معاملات کو واضح کرتا ہے۔

قرآن میں بیان کردہ یہ اعمال وقوانین مل کر شریعت اسلامی کی اس حتمی صورت کو انسانوں کے سامنے لاتے ہیں جس کا تذکرہ قرآن کے آغاز میں سورۂ فاتحہ میں ''صراطِ مستقیم'' کے نام سے کیا گیا ہے۔ سورۂ فاتحہ انسانوں کی دعا ہے۔ یہ رب سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی درخواست ہے۔ پورا قرآن بالعموم اور شریعت اسلامی بالخصوص اس دعا کے جواب میں نازل ہوتی ہے۔

ایک سوال

یہاں قرآن کے ایک قاری کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کے بنیادی مضامین توحید وآخرت اور شریعت اسلامی کے بیان پر بس نہیں کرتے، بلکہ اس کتاب الٰہی کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور دعوتی جدوجہد سے متعلق ہے۔ اس کی کیا حیثیت ہے اور اس میں ہمارے لیے کیا رہنمائی ہے؟ ہم ذیل میں اسی سوال کا جواب بالتفصیل بیان کریں گے، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جس کی صحیح نوعیت نہ جاننے کی بنا پر لوگوں کو بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ قرآن صرف عربوں کے لیے نازل ہوا تھا اور اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور بہت سے لوگ اس پوری جدوجہد کو امت سے متعلق کر کے خود کو اور امت کو ان ذمہ داریوں کا مکلّف بنا دیتے ہیں جن کا کوئی تقاضا خدا کی طرف سے نہیں۔ یوں نہ صرف خود کو اور امت کو مشکل میں ڈال دیتے ہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں دین کا نصب العین تک تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔

خدا کے نظام ہدایت میں رسول کی حیثیت

قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ آپ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول بھی تھے۔ خدا کے نظام ہدایت میں رسولوں کی ایک غیر معمولی حیثیت ہوتی ہے۔ عام انبیا کے برعکس اللہ کے رسول لوگوں کو صرف یہی نہیں بتاتے کہ اللہ ان کا تنہا رب ہے اور انھیں ایک روز اس کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس روز نیک لوگ جنت میں اور نافرمان جہنم میں جائیں گے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ ان رسولوں کے ذریعے سے آنے والی قیامت کا ایک عملی نقشہ اسی دنیا میں کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ رسولوں کے مخاطبین میں سے کفار کو دنیا ہی میں عذاب اور ایمان لانے والوں کو نجات دی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کئی رسول آئے۔ (ایک روایت کے مطابق تین سو تیرہ)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انھوں نے ایک طویل عرصہ تک اپنی قوم کو سمجھایا۔ ان کے مسلسل سمجھانے کے باوجود جب مخاطبین نے ان کی بات نہ مانی تو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے عذاب سے پہلے اس دنیا ہی میں ان پر تباہ کن عذاب مسلط کر دیا۔ قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم شعیب اور حضرت موسیٰ کے مخاطب فرعون کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔ رسولوں نے انھیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا، مگر ان کے کفر و ہٹ دھرمی کے بعد ان اقوام کو ہلاک کر دیا گیا۔ کسی کو پانی میں غرق کیا گیا، کسی پر آندھی مسلط کر دی گئی، کسی کو زلزلہ نے آلیا، کسی پر پتھر برسا دیے گئے اور کوئی کڑک کا شکار ہوا۔ حضرت یونس کی قوم عذاب کی زد میں آنے کے باوجود آخری وقت میں توبہ کر کے بچ گئی۔ جبکہ حضرت عیسیٰ کے منکر یہودیوں کے ساتھ، توحید سے وابستگی کی بنا پر، ذرا مختلف معاملہ کیا گیا۔ ان کی مجرم نسل کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ پھر اگلی نسلوں کو سوچنے کی مہلت دی جاتی ہے۔ جب وہ نہیں مانتے تو تھوڑے عرصہ میں پھر ان پر بدترین عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے، رومیوں کے ہاتھوں شام میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں عرب میں، عیسائیوں کے ہاتھوں اندلس میں اور ہٹلر کے ہاتھوں یورپ میں آیا ہوا عذاب اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ قرآن کے مطابق یہ سلسلہ تا قیامت چلتا رہے گا۔

ان رسولوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہ صرف انسانیت کو آخرت کے بارے میں خدا کے منصوبے سے آگاہ کرنے آئے تھے، بلکہ خاص طور پر قریش اور عربوں کو یہ بتانے آئے تھے کہ اگر انھوں نے آپ کی بات نہ مانی تو قیامت سے پہلے ان پر بھی خدا کا عذاب ایسے ہی آئے گا جیسے ان پچھلی قوموں پر آیا تھا۔ مذکورہ بالا رسولوں کے سارے قصے ـــــ اگلوں کی کہانیوں کے نام سے کفار جن کا مذاق اڑاتے تھے ـــــ اسی مقصد کے لیے قرآن میں بیان ہوئے کہ قریش کو سمجھا دیا جائے کہ ایک رسول کے آنے کی کیا اہمیت ہوتی ہے اور اس کے انکار کے نتائج کتنے بھیانک ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ لوگ نہ مانے اور کفر پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے انھیں آلیا اور ہلاک کر دیا۔ البتہ اس دفعہ رسول اللہ کے ساتھ ماننے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی، اس لیے یہ عذاب کسی ارضی یا سماوی آفت سے نہیں آیا، بلکہ آپ کے اصحاب کی تلواروں سے آیا۔ قریش کی پوری قیادت اس جرم میں ہلاک کر دی گئی۔ البتہ بقیہ عرب ایمان لے آئے اور خدا کی ان رحمتوں کے دنیا ہی میں حق دار بن گئے جو وہ دوسروں کو آخرت میں دے گا۔ یعنی ان پر آخرت سے پہلے ہی دنیا میں خدا کے انعامات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ پوری متمدن دنیا کے حکمران بنا دیے گئے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن ایک صحیفۂ رسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبین کا یہ معاملہ پچھلے رسولوں کی طرح محض ایک سنی سنائی داستان نہ رہا، بلکہ ایک ایسی تاریخی حقیقت بن گیا ہے جس کا انکار خدا اور آخرت کے بدترین منکر بھی نہیں کر سکتے۔ ایک انسان خدا اور قیامت کے بارے میں عقل و فطرت کے سارے دلائل کا انکار کر سکتا ہے۔ وہ انفس و آفاق کی ساری نشانیاں جھٹلا سکتا ہے۔ وہ انبیا اور صالحین کی ہر دعوت کو رد کر سکتا ہے، مگر وہ اس مسلمہ حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا کہ ساتویں صدی عیسوی میں ایک اُمی نے رسالت

کے دعوے کے ساتھ لوگوں کو توحید و آخرت کی طرف بلایا اور اس چیلنج کے ساتھ بلایا کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو دنیا ہی میں منکرین پر عذاب آئے گا اور ماننے والوں کا مقدر عروج و کامرانی ہوگی۔ صرف ۲۳ سال کی مدت میں یہ واقعہ معجزاتی طور پر رونما ہو گیا اور تاریخ کے صفحات مین ان مٹ طور پر نقش ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس داستان کو قرآن کے ذریعے سے محفوظ کرنے کا اہتمام کیا اور اس طرح کیا کہ انسانوں کے پاس قرآن سے زیادہ مستند تاریخ کا کوئی اور ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ آج ہم اس داستان رسالت کو قرآن میں پوری تفصیل کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ یہی داستان قرآن کے مضامین کا تیسرا حصہ تشکیل دیتی ہے۔ لوگوں پر اگر اس داستان کی درست حیثیت واضح رہے تو یہ ان کے لیے نصیحت اور عبرت کا سب سے موثر ذریعہ بن جائے گی۔ اس میں انھیں یہ پیغام ملے گا کہ توحید و آخرت کے انکار کے بعد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام رسولوں کے مخاطبین کے ساتھ ہوا تھا وہ قیامت کے دن ان کے ساتھ بھی ہو کر رہے گا۔ کسی کو اب بھی کوئی غلط فہمی رہ جاتی ہے تو اس کا علاج صرف یہی ہے کہ خدا غیب کا پردہ اٹھائے اور خود اس حقیقت کا اعلان کر دے۔ ایسا بھی یقیناً ہوگا، مگر اس روز ایمان لانے اور عمل صالح اختیار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

قرآن کا معجزہ کیا ہے؟

قرآن کے اس حصے کی حقیقی نوعیت جاننے کے بعد ہمارے لیے یہ سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن کا حقیقی معجزہ کیا ہے۔ معجزہ وہ خلاف عادت امر ہوتا ہے جو کسی پیغمبر کو اس کی دعوت کی تائید کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اس کے سامنے آنے کے بعد مخاطبین کے لیے یہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ پیش کرنے والا کوئی جھوٹا شخص نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے آیا ہوا پیغمبر ہے۔ اس کی صورت بالعموم یہ رہی ہے کہ یا تو مخاطبین اپنی مرضی کا حسی معجزہ طلب کرتے ہیں۔ ان کے اصرار پر اللہ کا پیغمبر دعا کرتا ہے اور وہی معجزہ رونما ہو جاتا ہے۔ جیسے حضرت صالح کی اونٹنی۔ یا بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے اپنے پیغمبر کو کوئی ایسا معجزہ عطا کرتے ہیں جسے مخاطبین اپنے پیمانوں پر بھی نہیں جھٹلا سکتے۔ مثلاً حضرت موسیٰ کے دور میں سحر و جادوگری کا بڑا زور تھا۔ چنانچہ عصا کا معجزہ جب فرعون اور اس کے جادوگروں کے سامنے آیا تو ان کا اپنا جادو اس کے سامنے ڈھیر ہو گیا اور انھیں یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ جادو سے بلند تر چیز ہے۔

قرآن مجید اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے اپنے اولین مخاطبین کے لیے ایک حسی معجزہ تھا۔ قریش اپنی تمام تر زبان دانی کے باوجود اس کے جواب میں اس جیسی ایک سورت بھی نہ لا سکے۔ تاہم اب رہتی دنیا تک جو چیز قرآن کو معجزہ بناتی ہے، وہ اس کی زبان نہیں، بلکہ اس کا ایک صحیفۂ رسالت ہونا ہے۔ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داستان رسالت کو جس طرح لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کے بعد کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور آپ کی دعوت کو سچا نہ مانے۔

آج کی دنیا علم کی دنیا ہے۔ جو چیز علمی طور پر ثابت ہو جائے، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آج کا انسان عقل و فطرت کے دلائل پر مبنی توحید و آخرت کی قرآنی دعوت کا انکار کر سکتا ہے، مگر وہ اس بات کو نہیں جھٹلا سکتا کہ آپ کی جو داستان قرآن میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بیان ہوئی ہے وہ سچ ہے، یہ ایک علمی اور تاریخی مسلمہ ہے جس کا انکار کرنے والا سورج کا بھی انکار کرسکتا ہے۔قرآن اس حقیقت کا سب سے مستند تاریخی ریکارڈ ہے کہ ایک پیغمبر نے تنہا اپنی دعوت کا آغاز کیا اور مخاطبین کو قیامت کے عذاب سے ڈرایا۔ساتھ میں یہ بھی بتایا کہ یہ قیامت دوسروں کے لیے تو بعد میں آئے گی، مگر مخاطبین کے لیے اسی دنیا میں برپا کردی جائے گی۔جس میں سارے منکرین کو ہلاک کردیا جائے گا اور مومنین کو زمین کا اقتدار سونپ دیا جائے گا۔یعنی جنت وجہنم کا جو معاملہ دوسروں کے ساتھ قیامت کے دن ہوگا، اس رسول کے مخاطبین کے ساتھ دنیا ہی میں ہو جائے گا۔تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ہوا اور اس طرح ہوا کہ اس رسول کا انکار کرنے والے قریش کے سردار جنگ بدر میں چن چن کر ہلاک کر دیے گئے۔یہ جنگ تاریخ کی واحد جنگ تھی جس میں کسی گروہ کے صرف سردار ہلاک ہوئے۔جبکہ دوسری طرف اس پیغمبر پر ایمان لانے والے بے سروسامان لوگ وقت کی دو عظیم سپر پاورز کو شکست دے کر دنیا کے حکمران بنا دیے گئے۔مستشرقین اور دنیا بھر کے تاریخ دان آج تک اس واقعہ کی کوئی تاویل نہیں کر سکے، جس طرح حضرت موسیٰ کے عصا کے سانپ بن جانے کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا عصا اب ہمارے پاس نہیں، البتہ قرآن اس نا قابل انکار حسی معجزے کی داستان سنانے کے لیے آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن کے مضامین کا خلاصہ

ہم نے اوپر جو تفصیلی گفتگو کی ہے، اس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں تاکہ جب اگلی دفعہ آپ قرآن سمجھ کر پڑھنے جائیں تو آپ کو معلوم رہے کہ آپ اس کتاب میں کیا پڑھنے جا رہے ہیں۔

قرآن بنیادی طور پر تین موضوعات پر گفتگو کرتا ہے۔اول وہ مضامین جو کچھ ایسے حقائق لوگوں کے سامنے رکھتے ہیں جنھیں انسان کو فطرت اور عقل عام کی بنیادوں پر مان لینا چاہیے۔مگر لوگ ان معاملات میں راہِ راست سے ہٹ گئے اور آج تک ہٹے ہوئے ہیں۔ان میں توحید و آخرت بالخصوص اور دیگر اخلاقی رویے بالعموم شامل ہیں۔یہی قرآن کی اصل دعوت ہے جو پوری انسانیت کے لیے ہے۔جو لوگ اس دعوت کو مان لیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن میں زندگی گزارنے کے رہنما اصول دیتے ہیں۔یہ شریعت اسلامی ہے جو قرآن کا دوسرا موضوع ہے۔اس میں کچھ اعمال اور کچھ قوانین ہیں جو قرآن اپنے ماننے والوں کے سامنے رکھتا ہے۔یہ وہ حصہ ہے جو ہم مسلمانوں سے براہِ راست متعلق ہے۔جو لوگ قرآن کی دعوت کا انکار کر دیتے ہیں، ان کے لیے قرآن ایک صحیفۂ رسالت کے طور پر سامنے آتا ہے۔یہ قرآن کا تیسرا موضوع ہے جو پچھلے رسولوں اور بالخصوص آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داستان کا احاطہ کرتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی دعوت کے انکار کے نتائج کتنے بھیانک ہو سکتے ہیں۔آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب دنیا میں تو یہ نتائج نہیں نکلیں گے، مگر قیامت میں ان کے نکلنے میں کوئی شبہ نہیں۔اسی طرح اس حصے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کے لیے پیغام ہے کہ قیامت آکر رہے گی۔پہلے یہ قیامت محدود پیمانے پر اللہ کے رسولوں کے ذریعے سے، کسی خاص قوم کے لیے برپا ہوئی اور اب کائناتی سطح

پر اسے اللہ تعالیٰ تمام انسانیت کے لیے برپا کریں گے۔اس لیے کوئی بھی اس بارے میں کسی دھوکے میں نہ رہے۔

قرآن کی ترتیب

ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں، وہ بہت واضح ہیں، مگر عام طور پر یہ لوگوں کے سامنے اس لیے نہیں آپاتیں کہ قرآن میں یہ مضامین علیحدہ علیحدہ ایک متعین عنوان کے ساتھ بیان نہیں ہوئے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی مسئلہ پیدا کر دیتی ہے کہ قرآن کے سارے مضامین اس کشمکش کے پس منظر میں نازل ہوئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخاطبین کے درمیان برپا تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اس پورے ماحول کو نظر انداز کر کے قرآن کی دعوت اور شریعت کو براہِ راست بیان کر دیا جاتا۔لہٰذا قرآن کی دعوت توحید و آخرت اور شریعت، دونوں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبین کی داستان کے ایک جز کے طور پر بیان ہوئی ہے۔اسی بنا پر یہ سارے مضامین آپس میں گتھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔تدبر قرآن کی ان مشکلات کو بڑی حد تک حلقہ فراہی کے اہل علم نے حل کر دیا ہے۔قرآن پر ان کے کام سے قرآن کی آیتوں اور سورتوں کا نظم اور باہمی ربط آج بالکل واضح ہو کر سامنے آ گیا ہے۔تفصیلات جاننے کے طلبگار جاوید احمد غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں مبادی تدبر قرآن کی بحث میں انھوں نے نظم کلام اور سبع مثانی کے عنوان کے تحت بہت تفصیل سے اس موضوع پر کلام کیا ہے۔ہم یہاں مختصراً قرآن کی موجودہ ترتیب اور اس میں ان مضامین کے مقام کو واضح کیے دیتے ہیں۔

قرآن آج جس ترتیب میں ہمارے پاس موجود ہے یہ وہ نزولی ترتیب نہیں ہے جس میں قرآن نازل ہوا تھا۔موجودہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم کی اور یہ توقیفی ترتیب کہلاتی ہے۔اس ترتیب میں جو حکمت ہے،اس کی طرف سورۂ حجر میں یوں اشارہ کیا گیا ہے:

''اور ہم نے (اے پیغمبر)، تم کو سات مثانی دیے ہیں، یعنی یہ قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔'' (الحجر ۱۵: ۸۷)

اس آیت میں مثانی مثنیٰ کی جمع ہے۔ یہ وہی مثنیٰ ہے جس کا ذکر سورۂ نساء (۴) آیت ۳ میں ہوا ہے۔جس میں کہا گیا کہ جو عورتیں تمھیں پسند آئیں، ان میں سے دو دو، تین تین اور چار چار سے تم نکاح کر لو۔یعنی مثنیٰ سے مراد وہ چیز ہے جو دو دو کر کے ہو۔اس آیت پر تفصیلی بحث مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہ کار تفسیر ''تدبر قرآن'' کی جلد ۴ کے صفحہ ۳۷۷ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

ان اہل علم کے کام کی روشنی میں قرآن کی موجودہ ترتیب میں جو حکمت ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی تمام سورتیں آپس میں دو دو کر کے جوڑوں (Pairs) کی شکل میں ہیں۔یعنی مضمون کے اعتبار سے ہر سورت اپنا ایک زوج (Partner) رکھتی ہے۔اس اصول سے بہت کم سورتیں مستثنیٰ ہیں۔مثلاً سورۂ فاتحہ۔ یہ سورتیں سات مجموعوں کی شکل میں مرتب کی گئی ہیں جنھیں ہم ابواب کہہ سکتے ہیں۔ان ابواب کا کوئی مخصوص موضوع بھی ہوتا ہے۔ ہر باب ایک یا ایک سے زائد مکی سورت سے شروع ہو کر ایک یا ایک سے زائد مدنی سورت پر ختم ہوتا ہے۔ہم اپنی بات کی وضاحت کے لیے پہلے باب کی وضاحت تفصیل سے کریں گے، کیونکہ اس میں سورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔جبکہ باقی ابواب کے ایک اجمالی بیان پر اکتفا کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پہلا باب پانچ سورتوں پر مشتمل ہے۔اس کی پہلی سورہ الفاتحہ مکی ہے، جبکہ بقیہ چار مدنی ہیں۔اس باب کا اصل موضوع خدا کی صراط مستقیم یعنی شریعت اوراس کے حاملین ہیں۔پہلی سورت الفاتحہ اس باب کے لیے بالخصوص اور پورے قرآن کے لیے بالعموم افتتاحیہ کے طور پر آئی ہے۔جس کا موضوع یہود ونصاریٰ کی گم راہی کے بعد انسانیت کی طلب ہدایت ہے۔اگلی دو سورتیں البقرہ اورآل عمران مل کرایک جوڑ بناتی ہیں۔پہلی میں یہودیوں اور دوسری میں عیسائیوں پر اتمام حجت کے بعد ایک نئی امت کی تاسیس کا اعلان ہے اوراس امت کے تزکیہ اورتطہیر کے لیے شریعت دی گئی ہے۔آخری دوسورتیں النساء اور المائدہ ایک جوڑا ہیں۔ان میں مسلمانوں کے تزکیہ اورترتیب کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے اوران کی انفرادی اوراجتماعی زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق شریعت کے احکام دیے گئے ہیں اوران سے توحید وشریعت سے وفاداری کا عہد لیا گیا ہے۔

دوسرا باب چار سورتوں پر مشتمل ہے۔پہلی دوالانعام اورالاعراف مکی ہیں اورآخری دو یعنی الانفال اورالتوبہ مدنی ہیں۔ تیسرا باب یونس سے النورتک پندرہ سورتوں پر مشتمل ہے۔ان میں آخری کو چھوڑ کر سب مکی ہیں۔ چوتھے باب میں الفرقان سے الاحزاب تک نوسورتیں ہیں۔پہلی آٹھ مکی اور آخری مدنی ہے۔ پانچواں باب سبا سے الحجرات تک سولہ سورتوں پر مشتمل ہے۔پہلی تیرہ مکی اور آخری تین مدنی ہیں۔ چھٹا باب سورۂ ق سے التحریم تک ہے۔ان میں سے ابتدائی سات مکی اورآخری دس مدنی ہیں۔ساتواں باب الملک سے الناس تک ہے۔آخری دو کو چھوڑ کر سب سورتیں مکی ہیں۔

قرآنی مضامین کی ترتیب

قرآنی سورتوں اورابواب کے اس پس منظر کو جاننے کے بعد قرآنی مضامین کی ترتیب کو سمجھنا مشکل نہیں رہتا۔جیسا کہ ہمارے بیان سے واضح ہے کہ شریعت بالعموم پہلے باب میں بیان ہوئی ہے۔گواس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن میں کسی دوسری جگہ شریعت کا کوئی بیان نہیں کیا گیا۔ہم دیکھتے ہیں کہ زنا اور بہتان کی سزا سورۂ نور میں اورطلاق کے معاملات کی تفصیل سورۂ طلاق میں بیان ہوئی ہے۔یہ دونوں سورتیں پہلے باب میں نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے بعد مخاطبین کے لیے جو قیامت جزیرہ نماے عرب میں برپا ہوئی، اس کی تفصیل دوسرے بابا میں ملتی ہے۔سورۂ انعام سے سورۂ توبہ تک اس باب میں داستان رسالت کا بیان ہے۔ یہ خاص عربوں کے حالات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اوراس کے دلائل کو بھی بیان کرتی ہے اوراگلے پچھلے منکرین کے انجام کو بھی۔اس کے بعد اگلے چارابواب میں زیادہ تر قرآن کی دعوت توحید وآخرت اوراس کے تفصیلی دلائل کا بیان ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ ماننے والوں کے لیے بشارت اورمنکرین کے لیے عذاب کی تفصیل بھی ہے۔ساتواں اورآخری باب خدا کے اس پیغام کا بیان ہے جسے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے یعنی انذار قیامت۔ یہ وہ قیامت ہے جو جزیرہ نماے عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں برپا ہوگئی، جبکہ پوری انسانیت کے لیے بہت جلد برپا ہونے والی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآنی مضامین کے اس پس منظر اور ان کی ترتیب کے بعد ہمیں اللہ کی رحمت سے یہ امید ہے کہ قرآن فہمی کا ذوق یقیناً آپ کو قرآن کے اصل مدعا تک پہنچا دے گا۔ البتہ اس ضمن میں بھی، دوران مطالعہ میں، کچھ چیزوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ قرآن میں آپ مضامین کی تکرار دیکھیں گے۔ اس تکرار کا مقصد یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ ایک دفعہ بات سمجھانا نہیں آتی۔ اصل بات یہ ہے کہ توحید و آخرت کی قرآنی دعوت ایک اخلاقی دعوت ہے۔ جبکہ انسان ایک مادی دنیا میں رہتے ہیں۔ مادی تقاضوں مثلاً بھوک وغیرہ کے لیے انھیں متحرک کرنا کوئی مسئلہ نہیں، مگر اخلاقی بنیادوں پر کچھ منوانا اور اس پر ان کے عمل کو منحصر کرنا اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ کوئی بات ان کے دل و دماغ میں راسخ نہ ہو جائے اور ان کی نفسیات کا حصہ نہ بن جائے۔ قرآن میں توحید و آخرت کے مضامین کی تکرار اصلاً یہی کام کرتی ہے۔ انسان کو جب بار بار اللہ کے سمیع و بصیر، حاضر و ناظر اور علیم و خبیر ہونے کا معلوم ہوتا ہے تو اس میں تقویٰ پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح جنت و جہنم کا بار بار بیان اس دنیا اور اس کے نفع و نقصان کو انسان کی نگاہوں میں بے وقعت بنا دیتا ہے اور یقیناً ایسا شخص اعمال صالحہ اختیار کر کے آخرت میں کامیاب ہو گا۔

اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ عوام الناس کو قرآن نہیں پڑھنا چاہیے، کیونکہ اس سے آدمی غلط نتائج تک پہنچ جاتا ہے تو یہ بات کلی طور پر درست نہیں۔ مضامین کی جو تقسیم ہم نے بیان کی ہے اور ان کے جو مقاصد بیان کیے ہیں، ان کی روشنی میں قرآن سے غلط استنباط کا امکان نہیں رہتا۔ قرآن کی اصل دعوت یعنی توحید و آخرت کا شعور اپنے اندر پیدا کرنا تو نجات کے لیے لازمی ہے۔ اور یہ شعور قرآن پڑھ کر ہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اخلاقیات کی یاددہانی اور شریعت کے اعمال مثلاً نماز وغیرہ کی سب سے زیادہ تاکید بھی قرآن ہی سے ملتی ہے۔ توحید و آخرت کی یاددہانی، اخلاقیات کی پابندی اور شریعت کے اعمال تو وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری روزمرہ دینی زندگی کا انحصار ہے۔ اگر ان کا شعور ذہن میں نہ رہے تو دین پر استقامت ممکن ہی نہیں رہتی۔

البتہ دو چیزیں ہیں جن کے بارے میں عوام الناس کو اپنی حد جان لینی چاہیے۔ ان میں سے پہلے شریعت کے قوانین ہیں۔ انھیں اہل علم کی مدد سے سمجھنا چاہیے اور انھی کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس میں بھی تین باتیں واضح رہیں: اول یہ کہ احکام ہر وقت اور ہر شخص کے لیے نہیں ہیں۔ مثلاً وراثت، نکاح، طلاق وغیرہ ایسے احکام ہیں کہ فرد کی روزمرہ زندگی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ قرآن انھیں بہت سادہ اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ آدمی ایک دفعہ ان کی باریکیاں اہل علم کی مدد سے سمجھ لے تو پھر غلطی کا اندیشہ نہیں رہتا۔ سوم یہ کہ قرآن میں جس طرح ان احکام کو بیان کیا گیا ہے، اس میں یہ اہتمام ہے کہ احکام سے زیادہ زور ان کے مقاصد اور خدا کی صفات پر رہتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر فرد سے متعلق ہیں اور ان کی یاددہانی از حد ضروری ہے۔

دوسری چیز جس کے بارے میں متنبہ رہنا چاہیے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داستان رسالت کا وہ پہلو ہے جس میں

آپ کی دعوت کو نہ ماننے اور کفر کے نتائج آپ کے مخاطبین کے لیے موت، ذلت، جلاوطنی اور مالی تاوان کی شکل میں نکلے۔ یہ پورا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخاطبین کے ساتھ خاص تھا۔ اس کو پڑھتے وقت یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ عملی طور پر اس معاملے کا کوئی تعلق ہم سے نہیں ہے۔ اس میں ہمارے لیے کوئی نمونہ نہیں۔ آج کسی عیسائی، یہودی اور ہندو وغیرہ کو اسلام نہ قبول کرنے کی بنا پر جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب مشرکین عرب کے لیے انتخاب اسلام یا موت کا تھا۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ پر جزیہ، جلاوطنی اور ذلت و ہلاکت کا عذاب مسلط کیا گیا۔

ہمارے لیے یہ داستان آخرت کی حسی دلیل ہے اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ معجزہ کی حد تک پہنچی ہوئی دلیل ہے۔ قرآن کے اس حصے کو اسی حیثیت میں پڑھنا چاہیے۔ جس طرح ہم قرآن میں توحید و آخرت کے انفسی یا آفاقی دلائل، مثلاً سورج و چاند کی گردش وغیرہ، کو پڑھ کر اللہ کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں، اسی طرح اس واقعہ کو خدا کی قدرت اور آخرت کی حسی دلیل کے طور پر لینا چاہیے۔ جس طرح ہم پہلے کو اللہ کا کام سمجھتے ہیں، دوسرے کو بھی اللہ کا کام سمجھنا چاہیے۔ اسی حیثیت میں ہمیں اس واقعہ کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ رہا آپ کا اتباع تو شریعت و اخلاق سے متعلق آپ کی زندگی کا ہر پہلو اور قرآن کا ہر حکم بشرط استطاعت ہم پر فرض ہے۔

قرآن آپ کے لیے ہے

قرآن خدا کا پیغام ہے۔ وہ پیغام جو خاص اس نے آپ کے لیے نازل کیا۔ یہ آپ کو خدا کی اس ابدی بادشاہی کی خبر دیتا ہے جسے بہت معمولی کوشش سے آپ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ آگ کے اس گڑھے سے آپ کو بچانا چاہتا ہے جس تک غفلت بھری زندگی آپ کو لے جا رہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہم سب انسان ہیں — خواب دیکھنے والے، خواہش کرنے والے۔ ہم سب انسان ہیں — تمنا کرنے والے، طلب رکھنے والے۔ ہم سب انسان ہیں جو امیدوں میں جیتے اور خوشیوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ ہم خوشبو کا، ذائقے کا، رنگ کا اور سُر کا احساس رکھتے ہیں۔ ہم لطف، لذت، سکون، سرور، چین اور قرار کی طلب رکھتے ہیں۔ مگر جس دنیا میں ہم جیتے ہیں وہ ہمارے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیتی۔ ہماری تمنائیں پوری نہیں ہونے دیتی۔ ہماری خوشیوں پر غم اور لذتوں پر تکالیف حاوی رہتی ہیں۔ ہمارے خواہشوں پر بار بار محرومی کی سیاہ چادر تن جاتی ہے۔ ایسے میں قرآن ہم سب کے لیے امید کا ایک دیا روشن کرتا ہے۔ وہ جنت کی لازوال نعمتوں کی خبر دیتا ہے۔ وہ اس کے لامحدود خزانوں کی امید دلاتا ہے۔ وہ ایک ایسی ابدی بادشاہی کی نوید ہے جس سے کوئی نکلنا چاہے گا نہ کسی کو نکالا جائے گا۔ جہاں ماضی کا کوئی پچھتاوا ہوگا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔

یہ ہے قرآن اور یہ ہے اس کی دعوت۔ جس نے اسے چھوڑا وہ دنیا میں ہلاک ہوا۔ جس نے اسے چھوڑا وہ آخرت میں ہلاک ہوا۔

ڈاکٹر محمد فاروق خان

المیۂ طالبان و افغانستان

طالبان عمل و اخلاق کا بہترین نمونہ تھے۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ جس چیز پر دوسروں کو عمل کرنے کا کہتے تھے، پہلے خود اس پر عمل کر دکھاتے تھے۔ سادہ، جفاکش، باحیا، پرعزم اور اپنے فہم اسلام کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنے والے تھے۔ صحابۂ کرام کے بعد تاریخ نے سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں کا نظارہ دیکھا تھا اور آج کے زمانے میں طالبان اس اخلاص و جفاکشی کی ایک جھلک پیش کرتے تھے، لیکن ایسا کیوں ہوا کہ پروردگار نے ان کو صرف چھ سال حکومت کرنے کا موقع دیا اور پھر ان سے یہ موقع چھین لیا۔ اس معاملے میں پروردگار کا قانون تو یہ ہے کہ ہم پر ہر مصیبت ہمارے اپنے ہاتھوں آتی ہے۔ ارشاد ہے:

> ''تمھیں جو بھلائی بھی پہنچتی ہے، وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے تو وہ تمھارے اپنے کسب و عمل کی وجہ سے ہے۔'' (سورۂ نساء ۴: ۷۹)

مزید ارشاد ہے:

> ''تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور بہت سے قصوروں سے اللہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔'' (سورۂ شوریٰ ۴۲: ۳۰)

افغانستان میں طالبان کی شکست اور ان کی حکومت کا خاتمہ اس صدی کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا تجزیہ مختلف جہتوں اور پہلوؤں سے کرنا ضروری ہے۔ مسلمان دانش وروں اور اہل علم کے لیے اس کا تجزیہ اس اعتبار سے بھی ضروری ہے کہ پچھلے تین سو برس سے مسلمان جنگ کے میدان میں شکست کھا رہے ہیں۔ سید احمد شہید کی تحریک، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، تحریک خلافت، سنوسی تحریک، مہدی سوڈانی اور اسی قبیل کی تمام تحریکیں اور حالیہ چیچنیا کی تحریک آزادی ناکامی سے کیوں دو چار ہوئیں؟ اس کے مقابلے میں افغانستان میں روسی افواج کے خلاف جدوجہد اور اس کے بعد بوسنیا اور کوسووو کی تحریکیں کیوں

کامیاب ہوئیں؟ اہل علم کے لیے یہ سوال بھی بہت اہم ہے کہ کیا افغانستان کے اندر طالبان متبادل راستہ اختیار کر کے اپنی حکومت کو مزید مضبوط نہیں بنا سکتے تھے؟ یہ تمام سوالات پوری امت مسلمہ اور اس کے اہل دانش کے لیے انتہائی اہم ہیں اور ان کا غیر جذباتی تجزیہ لازم ہے۔

طالبان کی بحث سے پہلے یہ مناسب ہے کہ پچھلی تاریخ کا بھی مختصراً جائزہ لیا جائے۔ ظاہر شاہ ۱۹۳۳ء میں بادشاہ مقرر کر دیے گئے۔ اس کے چالیس سال بعد ۱۹۷۳ء میں ان کے چچا زاد بھائی سردار داؤد نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کے پانچ برس بعد اپریل ۱۹۷۸ میں کمیونسٹوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور نور محمد ترکئی کو صدر بنایا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد ستمبر ۱۹۷۹ میں کمیونسٹوں کے ایک اور دھڑے کے سربراہ اور وزیر دفاع حفیظ اللہ امین نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس کے دور میں حالات بہت بگڑ گئے، چنانچہ دسمبر ۱۹۷۹ میں روسی افواج افغانستان میں داخل ہو گئیں اور ببرک کارمل کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ، پاکستان، چین اور عرب ممالک کے تعاون سے مجاہدین نے باقاعدہ مزاحمت شروع کر دی۔ مجاہدین کے بیش تر رہنما سردار داؤد کے وقت ہی سے پاکستان میں مقیم تھے۔ اس وقت ایک ہی تنظیم ''جمعیت اسلامی'' تھی جس کے قائد برہان الدین ربانی اور سیکرٹری جنرل گل بدین حکمت یار تھے۔ چونکہ اس معرکے میں پاکستان ہی فرنٹ لائن ریاست تھی، اس لیے پاکستان کا کردار اور اس کے فیصلے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی اور انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ افغانستان میں روسی مداخلت کی مزاحمت کرنی ہے۔ یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا، اس لیے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو روس کا اگلا نشانہ پاکستان ہوتا۔ تاہم حکمت عملی کے لحاظ سے اس وقت پاکستان سے ایک فاش غلطی ہوئی۔

دنیا کی تاریخ کے جنگی تجربات سے یہ متفقہ سبق ملتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی بھی یہی ہدایت ہے کہ صرف وہی مسلح مزاحمت کامیاب ہوتی ہے جس کی ایک متفقہ تنظیم ہو، اس کا سیاسی نظم ہو اور فوجی تنظیم اس کے ماتحت ہو۔ اس کی پشت پر ایک مضبوط ریاست علی الاعلان کھڑی ہو۔ اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ افغان مجاہدین کی ایک متفقہ جلاوطن حکومت بنتی۔ اسی کی سربراہی میں جنگ آزادی لڑی جاتی اور دوسرے ممالک مثلاً پاکستان، امریکہ وغیرہ سے وہی جلاوطن حکومت معاہدے کرتی، لیکن پاکستان نے اس کے برعکس طریقہ اختیار کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ مجاہد تنظیمیں بنیں۔ چنانچہ کچھ تنظیمیں تو براہ راست بنائی گئیں مثلاً حکمت یار نے ربانی سے الگ ہو کر ۱۹۷۹ء میں ''حزب اسلامی'' قائم کر لی۔ مولوی یونس خالص نے حکمت یار سے اپنا دھڑا الگ کر لیا۔ پھر پروفیسر سیاف نے ۱۹۸۰ء میں ''اتحاد اسلامی'' قائم کی۔ جناب مجددی نے ''جبہ نجات ملی'' قائم کی۔ مولوی محمد نبی محمدی نے ''حرکت انقلاب اسلامی'' قائم کی۔ پیر گیلانی نے ''محاذ ملی افغانستان'' قائم کی۔ اس کے علاوہ اسی عمل سے شہ پا کر اہل تشیع کی بھی کئی تنظیمیں بن گئیں۔ پاکستان نے اس عمل کی خوب خوب حوصلہ افزائی کی۔ اس سے جنرل ضیاء کی حکومت کا اصل مقصد یہ تھا کہ تمام افغان تنظیمیں ایک خاص حد سے زیادہ طاقت ور نہ ہونے پائیں اور اس طرح ان کے قابو میں رہیں۔ اس طرح ان کو یہ فائدہ ہوتا کہ اپنے مفادات کی مدنظر رکھتے ہوئے افغانستان کے بارے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں اصل فیصلے کا اختیار ان کے پاس رہے اور امریکی امداد میں وہ اپنا حصہ زیادہ سے زیادہ رکھ سکیں۔ یہ بہت خود غرضانہ، غلط اور بے اصولی پر مبنی مقصد تھا۔ اور مستقبل کے تمام مسائل نے اسی فیصلے سے جنم لیا۔

ظاہر ہے کہ جب مختلف مسلح تنظیموں کے پاس وسائل، ڈالر اور اسلحہ موجود ہو تو علاقے پر قبضے کے لیے وہ آپس میں بھی لڑیں گی۔ چنانچہ یہ تمام تنظیمیں آپس میں بھی لڑتی رہیں اور روسیوں کے خلاف بھی لڑتی رہیں۔ چونکہ مجاہدین کی کوئی جلاوطن حکومت موجود نہیں تھی، اس لیے اقوام متحدہ کے تحت جینیوا مذاکرات میں ان کی نمائندگی نہیں تھی اور پاکستان کا نمائندہ موجود تھا۔ گویا پاکستان نے تمام پتے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۸ء میں جینیوا معاہدے پر دستخط افغانستان کے ڈاکٹر نجیب اللہ کے نمائندے اور حکومت پاکستان کے ہوئے۔ اگر اس کے بجائے یہی معاہدہ ڈاکٹر نجیب اللہ اور مجاہدین کی جلاوطن حکومت کے درمیان ہوتا تو پر امن انتقال اقتدار عمل میں آتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ پاکستان کا پانچواں صوبہ بننے کے بجائے ایک آزاد افغانستان ہوتا۔

فروری ۱۹۸۹ میں روسی افواج افغانستان سے نکل گئیں اور اس کے بعد تین برس تک ڈاکٹر نجیب اور مجاہدین کے درمیان لڑائی جاری رہی۔ مارچ ۱۹۹۲ میں کابل کے دفاع پر مامور جنرل رشید دوستم کی بغاوت کی وجہ سے احمد شاہ مسعود کو کابل پر قبضے کا موقع ملا۔ اب ایک اور خون ریز دور کا آغاز ہوا جس میں تمام مجاہدین تنظیمیں آپس میں لڑتی رہیں۔ اگلے چار برس پورا افغانستان لاقانونیت، ظلم، بے انصافی اور طوائف الملوکی کی تصویر بنا رہا۔ حتیٰ کہ اسی انارکی کے دوران میں طالبان نے جنم لیا۔ گویا افغانستان کے حالات کی خرابی میں روسی افواج کی مداخلت کے بعد سب سے زیادہ کردار جنرل ضیاء کی غلط پالیسی کا تھا۔ جماعت اسلامی بھی اس ذمہ داری میں شریک تھی، کیونکہ جماعت اسلامی اس پورے دور میں اس پالیسی کی پشت پر رہی۔ نیز تمام افغان مجاہد تنظیمیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے کسی تنظیم کی قیادت نے افغانستان کے اتحاد اور اسلام کے ارفع و اعلیٰ اصولوں کی خاطر اپنی انا کی قربانی نہیں دی۔

طالبان تحریک اصلاً اس انارکی کے خلاف عوام کے سب سے بڑے فعال طبقے یعنی دینی مدارس کے نوجوان طلبہ کا احتجاج اور بغاوت تھی۔ یہ بنیادی طور پر ایک مقامی اور دیسی تحریک تھی۔ تاہم اس کی پرداخت میں جنرل نصیر اللہ بابر، دیگر پاکستانی اداروں، سی آئی اے، تیل کمپنی یونی کال اور سعودی عرب نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔

طالبان نومبر ۱۹۹۴ میں منظر عام پر آئے۔ اسی مہینے میں قندھار پر قبضہ کر لیا اور اگلے دو سال کے اندر اندر یعنی ستمبر ۱۹۹۶ تک کابل پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس دو سالہ لڑائی کے دوران میں خون ریزی یقیناً ہوئی، لیکن وہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کی جنگوں کی لحاظ سے مقابلتہً بہت کم تھی۔ یہ پورا علاقہ جس پر اب تک طالبان نے قبضہ کیا تھا، پشتون اکثریت کا علاقہ تھا، سوائے ہرات کے جہاں تاجک اکثریت میں تھے۔ واضح رہے کہ طالبان تحریک کی تقریباً تمام لیڈرشپ پشتونوں پر مشتمل تھی۔ تحریک کے وقتاً فوقتاً پچاس بڑے لیڈروں میں سے صرف تین یا چار غیر پشتون تھے (وقتاً فوقتاً اس لیے کہ بسا اوقات ملا

محمد عمر اپنی کابینہ میں یک دم کافی تبدیلیاں لے آتے تھے۔) اس کے بعد طالبان اگلے پانچ سال تک غیر پشتون علاقے فتح کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ ان میں تاجک، ہزارہ اور ازبک شامل تھے۔ ان علاقوں پر قبضہ کے لیے بہت خون ریزی ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ سال کے عرصے میں دوطرفہ لڑائی میں پچاس ہزار سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ ان میں سے کئی علاقوں پر کئی کئی مرتبہ کامیابی اور پسپائی ہوئی۔ مثلاً مئی ۱۹۹۷ میں طالبان نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا اور پھر انھیں وہاں سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اگست ۱۹۹۸ میں طالبان نے ایک دفعہ پھر مزار شریف پر قبضہ کر لیا۔ یہی حالت بہت سے دوسرے علاقوں کی رہی۔ طالبان کی فیصلہ کن شکست تک یہ لڑائی جاری تھی۔ پشتونوں اور غیر پشتونوں کے درمیان اس لڑائی میں دونوں طرف سے ایک دوسرے پر بہت مظالم بھی ڈھائے گئے۔ مثلاً مزار شریف میں ستمبر ۱۹۹۷ میں دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کے ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہلاک کیے۔ اس کے بعد جب اگست ۱۹۹۸ میں طالبان نے دوبارہ مزار شریف پر قبضہ کیا تو انھوں نے ہزروں کی تعداد میں ہزارہ قبائل کا قتل عام کیا۔

اس مختصر تاریخ کے بعد یہ ممکن ہے کہ ہم ان اسباب کا کھوج لگائیں جن کی وجہ سے طالبان حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس زوال کی چند بنیادی وجوہات ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

طالبان تقریباً تمام پشتونوں پر مشتمل تھے اور وہ سب صرف ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ طالبان نے پشتون علاقے میں جنم لیا۔ ان کی تقریباً تمام لیڈر شپ اور تمام فوج بھی پشتونوں ہی پر مشتمل تھی۔ یہ اس لیے تھا کہ تمام بدامنی دراصل زیادہ تر پشتون علاقے میں تھی۔ طالبان کا ظہور دراصل اسی بدامنی کا ردعمل تھا۔ ازبک، تاجک، ہزارہ اور دیگر علاقے پرامن تھے۔ ان کے ہاں مستحکم اقتدار تھا، اس لیے وہاں کوئی ردعمل بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ طالبان کو اصل کامیابی پشتون علاقے ہی میں ملی اور اس علاقے میں امن وامان کے قیام سے عوام نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کے بعد طالبان نے غیر پشتون علاقوں کا رخ کیا اور ان پر حملہ آور ہوئے۔ یہ طالبان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ ان علاقوں میں عموماً امن تھا، اس لیے طالبان کے حملے کا کوئی جواز نہ بنتا تھا۔ ان علاقوں کے لوگ اور ان کی حکومتیں ممکن ہے طالبان کے معیار اسلام پر پوری نہ اترتی ہوں، تاہم یہ لوگ بہتر مسلمان تھے اور یہ بہت غیر مناسب تھا کہ ان پر فوج کشی کی جاتی۔ جب ان علاقوں پر ایک ایسی فوج نے حملہ کیا جو ساری کی ساری پشتونوں پر مشتمل تھی اور جس کا ہرات کا سابقہ ریکارڈ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس نے مقامی انتظام وحکومت میں بھی کوئی غیر پشتون شامل نہیں کیا تو اس سے قدرتی طور پر غیر پشتونوں نے یہی سمجھا کہ پشتون ان کو غلام بنانے آ رہے ہیں۔ چنانچہ غیر پشتونوں نے اس کے خلاف نہایت سخت مزاحمت کی۔ اور آخر وقت تک طالبان اس قابل نہیں ہو سکے کہ اس پورے علاقے پر قبضہ کر سکیں۔

طالبان صرف ایک ہی طبقے یعنی دینی مدارس سے فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل تھے۔ انھوں نے حکومت میں کبھی کسی غیر طالب کو شامل نہیں کیا۔ حالانکہ اس طبقے سے باہر بھی بہت سے اچھے مسلمان موجود تھے۔ اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ

طالبان کے اذہان وسیع نہ ہو سکے۔ اور اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ باقی تمام طبقات نے اپنے آپ کو طالبان کا محکوم سمجھ لیا۔

طالبان کے لیے مناسب حکمت عملی یہ تھی کہ ستمبر ۱۹۹۶ میں کابل اور پورے پشتون بیلٹ پر قبضہ کرنے کے بعد وہ اعلان کرتے کہ وہ باقی تمام نسلی گروہوں اور طبقوں سے گفتگو کے ذریعے سے ان کو بھی شریک اقتدار کریں گے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو آج سے پانچ برس قبل ہی افغانستان میں امن کی شروعات ہو جاتیں۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا جس کے نتیجے میں افغانستان کے مزید پانچ برس خانہ جنگی کی نذر ہوئے اور مزید پچاس ہزار افراد موت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس کی ذمہ داری اصلاً طالبان پر عائد ہوتی ہے۔

طالبان کا فہم اسلام

طالبان نے اسلام کے فوری نفاذ کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اس کو حاصل کرنے میں انھوں نے جو بے اعتدالیاں کیں، وہ ہمیشہ کے لیے تاریخ کے صفحات پر ثبت ہو گئیں۔ اس معاملے میں ان سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ انھوں نے اسلام کے نام پر ایسی چیزوں پر پابندی لگا دیں یا ان کے بجالانے کا حکم دیا جو کسی طرح بھی بنیادی احکام کے ضمن میں نہیں آتیں، جن کے جواز و عدم جواز پر فقہا کے درمیان بہت اختلاف رائے ہے اور جن کو قانون کے زور پر پچھلے چودہ سو برس مین کبھی نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ دور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور دور خلفاے راشدین بھی ان امور کے ضمن میں کسی قسم کی قانون سازی یا سزاؤں سے خالی نظر آتا ہے۔ مثلاً طالبان نے موسیقی کو ممنوع قرار دیا۔ سب مردوں پر ایک مٹھی کی مقدار سے زیادہ داڑھی رکھنا لازم قرار دیا۔ ٹی وی اسٹیشن بند کر دیے گئے۔ طالبان کا سب سے بڑا نشانہ خواتین تھیں۔ طالبان جہاں جہاں بھی گئے، خواتین کے اسکول بند کر دیے گئے۔ خواتین کا کسی مرد کے بغیر گھر سے نکلنا ممنوع کر دیا گیا، حالانکہ محتاط ترین فقہا کے نزدیک بھی کوئی عورت ایک دن اور ایک رات تک گھر سے اکیلی باہر جا سکتی ہے۔ خواتین کے لیے گھر سے باہر کام منع کر دیا گیا اور ان پر لازم کر دیا گیا کہ وہ صرف اور صرف ایک خاص قسم کا نیلا برقعہ پہنیں گی۔ حجاب کے طور پر چادر لینے یا کسی بھی دوسرے برقعے کے پہننے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ وہ نیلا برقعہ ہے جسے صرف دیہاتی پشتون آبادی استعمال کرتی ہے۔ گویا طالبان نے اسلام کے نام پر افغانستان کے دیہاتی پشتون کلچر کو سارے ملک پر نافذ کیا۔

اسی طرح یہ لازم کر دیا گیا کہ تمام تعلیم یافتہ لوگ ہر وقت کالی پگڑی پہنیں گے۔ یہ درحقیقت دینی مدارس کے کلچر کو پورے افغانستان میں حاوی کرنے کی کوشش تھی، کسی بھی حکم کی خلاف ورزی پر عجیب سزائیں مقرر تھیں جن میں تحقیر، تمسخر اور تکبر کا پہلو نمایاں تھا۔ مثلاً پاکستانی فٹ بال کے تمام کھلاڑیون کے، عین کھیل کے درمیان میں کھیل روک کر، غیر شرعی لباس پہننے کے جرم میں سر منڈوا دیے گئے۔ اسلام کے نام پر اس طرح کے اقدامات درحقیقت اسلام کو بدنام کرنے کے مترادف تھے۔ اس سے غیر مسلموں اور عام لوگوں کے سامنے اسلام کی جو تصویر بنی، اس کا اندازہ ہر ذی فہم شخص لگا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے طالبان نے اسلام کے نام پر ہر وہ کام کیا جس میں خیریت تو موجود تھی، مگر جس سے اسلام کا ایک غلط تاثر ابھرتا تھا، مثلاً بامیان میں بدھا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے مجسموں کا انہدام یا عیسائیت پھیلانے کے نام پر مختلف امدادی کارکنوں کی گرفتاری اوران کے خلاف مقدمے وغیرہ۔

اس کے بجائے طالبان کو چاہیے تھا کہ وہ اسلام کے احکام کو اسی طرح نافذ کرتے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے نافذ کیا تھا۔ اس پورے دور میں صرف ایک مثبت چیز بجبر نافذ کی گئی اور وہ تھی زکوٰۃ۔ اس کے علاوہ ہر ہدایت اور حکم کو ترغیب، تلقین اور ذہنی تربیت کے ذریعے سے نرمی اور محبت سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف بڑے جرائم پر انتہائی سزائیں بھی صرف اسی وقت نافذ کی گئیں جب معاشرے کی پوری تربیت کی گئی اور جب ان جرائم کی طرف لے جانے والے عوامل تقریباً ختم ہوکر رہ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حجاب کی کسی بھی خاص شکل کو نافذ نہیں کیا گیا اور کسی کو بھی اس طرح کی چیزوں کی خلاف ورزی پر کوئی سزا نہیں دی گئی۔ اس طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں لاکھوں مربع میل کے علاقے فتح ہوئے، ہزاروں لاکھوں لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، مگر وہ پورا زمانہ داڑھی، حجاب اور اسی قبیل کے دوسرے امور کے متعلق سزاوں سے خالی رہا۔ درحقیقت طالبان کا تجربہ نفاذ اسلام اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ تھا جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے خواتین اور عام لوگوں میں انقباض و لاتعلقی کی ایک کیفیت پیدا ہوگئی۔

طالبان کے ہاں جمہوریت، آزادی رائے اور اپنے مخالفین کے لیے انصاف، عفو و درگزر اور رواداری کا جذبہ مفقود تھا۔ اسی طرح ان میں رفاہ عامہ کے کاموں کی طرف بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی، اگر وہ ستمبر ۱۹۹۶ کے بعد ملک کے اندر مکالمہ پر مبنی حکمت عملی کی ابتدا کرتے اور اقوام عالم سے اس میں مدد کی اپیل کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے بھی اقوام عالم سے درخواست کرتے تو شاید اب تک افغانستان کی کایا پلٹ چکی ہوتی اور طالبان غالب پارٹنر کی حیثیت سے ایک خوب صورت، متعدل اسلامی افغانستان کے حکمران ہوتے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

القاعدہ کے متعلق طالبان کی پالیسی

طالبان کی خارجہ پالیسی پہلے دن سے ہی دوسرے ممالک کے لیے تحقیر کی بنیاد پر قائم تھی۔ دنیا بھر میں پاکستان ہی ان کا ساتھی تھا، مگر پاکستان کی درخواست کے برعکس انھوں نے ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ ظاہر ہے یہ پاکستان کے وجود کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔ پاکستان کے بے شمار سنگین مجرموں نے طالبان کے ہاں پناہ لی تھی۔ انھیں پاکستانی حکام کے حوالے کرنے سے مسلسل ٹال مٹول کا رویہ اختیار کیے رکھا۔ یہی صورت حال ان کی القاعدہ تنظیم اور بن لادن کے بارے میں تھی۔

بن لادن ۱۹۸۰ء میں افغانستان آئے۔ اور دس برس بعد واپس سعودی عرب چلے گئے۔ اگلے دو سال وہ سعودی عرب میں ہی مقیم رہے۔ پھر ۱۹۹۲ء میں وہ سوڈان چلے گئے۔ وہاں چار برس رہنے کے بعد وہ مئی ۱۹۹۶ میں اپنے درجنوں ساتھیوں سمیت جلال آباد پہنچے۔ اس وقت یہاں شمالی اتحاد اور طالبان کی کشمکش عروج پر تھی، تاہم بن لادن نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ان کے جلال آباد پہنچنے کے چار مہینے بعد وہاں طالبان کا قبضہ ہوگیا۔

سوال یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء میں افغانستان چھوڑنے کے چھ سال بعد وہ واپس کیوں آئے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس دفعہ نہ تو جہاد کے لیے آئے تھے، نہ شمالی اتحاد اور طالبان کے درمیان آویزش میں حصہ لینے آئے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب خلیجی جنگ کے موقع پر امریکی افواج سعودی عرب پہنچیں تو بن لادن نے اسے اسلامی تعلیمات کے خلاف جان کر ان پر کھلے بندوں تنقید شروع کر دی۔ جب خلیجی جنگوں کے بعد بھی امریکی افواج سعودی عرب میں مقیم رہیں تو بن لادن نے سعودی حکمرانوں کو اسلام کا غدار کہنا شروع کیا۔ اور اپنے لیے یہ مشن بنا لیا کہ وہ امریکی افواج کو سعودی عرب سے نکال کر رہیں گے۔ یہی مشن لے کر وہ سوڈان گئے اور جب سوڈان پر دباؤ بہت بڑھ گیا تو یہی مشن لے کر وہ افغانستان چلے گئے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعودی عرب میں امریکی افواج کے آمد کے متعلق چند اہم امور کی نشان دہی کی جائے۔ جب کویت پر عراق نے قبضہ کر لیا تو اس نے ایک طرف کھلم کھلا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اب سعودی عرب اس کا اگلا ٹارگٹ ہے۔ دوسری طرف خلیجی تعاون کونسل کے معاہدوں کی رو سے سعودی عرب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ جارح ملک کو کویت سے نکالنے کے لیے اقدام کرے، چنانچہ سعودی عرب نے سب سے پہلے مسلمان ملکوں سے رابطہ کیا، مگر جب کسی مسلمان ملک سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا تب اس کی یہ مجبوری بنی کہ وہ امریکہ سے اس معاملے میں مدد مانگے۔ چنانچہ امریکہ نے اقوام متحدہ کے جھنڈے تلے پورے مغرب کو اپنے ساتھ ملا کر یہ مدد فراہم کی۔ کویت سے عراقی فوج کا انخلا ہو گیا، مگر صدام حسین کی حکومت بدستور موجود تھی۔ چنانچہ سعودی عرب ہی کی درخواست پر کچھ امریکی افواج وہیں دو اڈوں میں رہ گئیں۔ ان افواج کی کل تعداد چھ ہزار تھی۔ یہ افواج سعودی حکومت کی ہدایت اور اجازت کے بغیر کوئی اقدام نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ سعودی اجازت کے بغیر نہ وہاں کوئی طیارہ اتر سکتا تھا، نہ وہاں سے اڑ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ افغان بحران میں جب سعودی عرب نے امریکہ کو یہ ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت نہ دی تو وہ ان سے طالبان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گویا یہ بات واضح ہے کہ سعودی عرب میں امریکی فوجیں ایک خاص سیاسی صورت حال کی وجہ سے ٹھہری ہوئی تھیں اور اگر بن لادن چاہتے تھے کہ ان افواج کو سعودی عرب سے نکال دیا جائے تو اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ وہ سعودی شاہی خاندان کو مستقل اس مقصد کے لیے ترغیب دیتے رہتے کہ سعودی افواج کو اتنا مضبوط بنایا جائے کہ وہ اپنے ملک کا دفاع کرنے کے قابل ہو سکیں اور یوں امریکی افواج کی کوئی ضرورت نہ رہے۔ بن لادن خاندان کے سعودی حکمرانوں سے نہایت گہرے تعلقات تھے اور اگر بن لادن اس مقصد کے لیے اپنی دولت اور دوسرے ذرائع استعمال کرتے تو شاید اب تک امریکی افواج سعودی عرب نے نکل چکی ہوتیں۔ بہر حال جب بن لادن مئی ۱۹۹۶ میں افغانستان آئے تو ان کے سامنے یہی مشن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگست ۱۹۹۶ میں انھوں نے پہلی بار امریکیوں کے خلاف اعلان جہاد (اعلان جنگ) کیا۔ طالبان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انھوں نے ملا عمر کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا اور قندھار چلے گئے۔ ان کی زیر سرکردگی بہت سے کیمپ بنائے گئے

جہاں سیکڑوں عربوں اور دوسری قومیتوں کے لوگوں کو مسلح تربیت دی جاتی تھی۔

۲۳ فروری ۱۹۹۸ کو خوست کیمپ میں القاعدہ سے وابستہ تمام گروپوں نے ایک منشور جاری کیا جس میں یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا گیا اور یہ فتویٰ دیا گیا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک کے ہر باشندے خواہ وہ عام شہری ہو یا فوجی کو قتل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

جب اگست ۱۹۹۸ میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکوں میں دو سو بیس افراد ہلاک ہوئے، تو قدرتی طور پر سب کی نگاہیں بن لادن کی طرف اٹھیں۔ بن لادن نے بھی اپنے ایک بیان میں حملہ آوروں کی تعریف و تحسین کی۔ جتنے افراد کو ان مقدموں میں مورد الزام ٹھہرایا گیا اور جن کو عدالتوں کی طرف سے سزائیں دی گئیں، ان سب نے القاعدہ سے تعلق کا اعتراف کیا۔ یہ عین قدرتی امر تھا کہ امریکہ طالبان حکومت سے یہ مطالبہ کرتا کہ القاعدہ تنظیم سے وابستہ افراد کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ اس معاملے میں امریکہ نے اقوام متحدہ کو بھی ساتھ ملایا اور اس کی طرف سے یہ متفقہ قرارداد منظور ہوئی کہ ملزموں کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔

اس کے جواب میں طالبان کی طرف سے دو وضاحتیں پیش کی گئیں۔ پہلا جواز یہ تھا کہ یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں اور دوسرا جواز یہ تھا کہ ان کی نقل و حرکت محدود کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں جواب بہت کمزور تھے۔ کسی مہمان کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ میزبان ملک میں بیٹھ کر کسی اور ملک کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ اس اعلان جنگ کو آج تک واپس نہیں لیا گیا۔ طالبان نے بھی کبھی اس کی مذمت نہیں کی، بلکہ بن لادن نے ہر موقع پر اس کی بار بار تائید و حمایت کی۔ گویا القاعدہ تنظیم کے ہیڈ کوارٹر کی افغانستان میں موجودگی طالبان کے لیے آگ سے کھیلنے کے مترادف تھی۔ لیکن وہ اس کا ادراک نہ کر سکے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ کے بعد طالبان کا موقف

۱۱ ستمبر کے سانحے کے بعد امریکہ نے بہت واضح الفاظ میں طالبان کو الٹی میٹم دیا کہ القاعدہ تنظیم کے اہم ارکان کو اس کے حوالے کر دیا جائے ورنہ وہ افغانستان پر حملہ کر دے گا۔ اسی کے ساتھ اقوام متحدہ نے بھی اپنی متفقہ قرارداد کے ذریعے سے طالبان سے یہ مطالبہ کیا کہ ملزموں کو امریکہ کے حوالے کیا جائے۔ اس وقت طالبان کے پاس دو راستے تھے: ایک یہ کہ القاعدہ کے اہم ارکان کو امریکہ کے حوالے کر کے اپنے ملک اور اپنی حکومت کو تباہی سے بچایا جائے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ انکار کیا جائے۔ چنانچہ طالبان نے انکار والا راستہ پسند کیا۔ یہ بات ہر انسان کو سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس انکار کی صورت میں القاعدہ کے ساتھ ساتھ طالبان حکومت بھی جائے گی اور ممکنہ تباہی سے اموال و املاک اور عام انسانی جانوں کا اتلاف بھی یقیناً ہوگا۔ تاہم طالبان نے اپنے جواب کی حمایت میں چند دلائل دیے۔ پہلی دلیل یہ تھی کہ یہ حق و باطل اور کفر و اسلام کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ہماری غیبی مدد ہوگی۔ امریکہ اسی طرح جنگ ہارے گا جس طرح ابابیل کے مقابلے میں ابرہہ اور ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں نمرود ہارا تھا۔ ایک افغانی دس امریکیوں پر بھاری ہوگا۔ یہ دلیل ملا عمر نے اپنی ہر تقریر میں دہرائی۔ بلکہ اپنی ہر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تقریر میں وہ اس موازنے کے بعد یہ بھی کہتے کہ ایک طرف خدا کا وعدہ ہے اور دوسری طرف بش کی دھمکی۔ دیکھتے ہیں دونوں میں سے کس کی بات پوری ہوتی ہے۔ پاکستان کے اکثر مذہبی لیڈروں نے بھی اس دلیل کو اپنی تقریروں میں دہرا کر نہ صرف طالبان کی پیٹھ ٹھونکی، بلکہ پاکستانی عوام کو بھی یہ یقین دلایا کہ غیبی مدد آیا ہی چاہتی ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ خواہ ہم کچھ بھی کریں امریکہ لازماً ہم پر حملہ کرے گا۔ اگر ہم القاعدہ کے ارکان ان کے حوالے کر بھی دیں تب بھی وہ ہمارے خلاف کوئی اور بہانہ ڈھونڈ لے گا۔ اس لیے ڈٹے رہنے میں ہی ہماری بہتری ہے۔ ان کی تیسری دلیل یہ تھی کہ یہ اصول کا معاملہ ہے۔ ہم بغیر کسی ثبوت کے بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو امریکہ کے حوالے نہیں کریں گے خواہ اس میں ہماری جانیں اور ہماری حکومت ہی کیوں نہ چلی جائے۔ بہر حال ہم اصولوں پر سمجھوتا نہیں کریں گے۔

مناسب ہے کہ ان تینوں دلائل کا مختصر تجزیہ کیا جائے۔ جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے تو یہ پروردگار کا واضح حکم ہے کہ مقابلے کی پوری قوت فراہم رکھی جائے۔ جب سامان حرب واسلحہ میں دو قومیں ایک دوسرے کے برابر ہوں تب اگر زیادہ صبر واستقامت والی طاقت افرادی قوت کے اعتبار سے کچھ کم بھی ہو، تب بھی وہ مقابلہ جیت سکتی ہے۔ دور رسالت اور دور صحابہ کی تمام جنگوں میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان اسلحہ کی تعداد میں یقیناً فرق رہا ہے لیکن دونوں طرف سے ہمیشہ ایک ہی جیسے ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ دشمن کے پاس کوئی ایسا ہتھیار ہو جو مسلمانوں کے پاس نہ ہو۔ پچھلے تین سو برس کی تاریخ مسلسل ہمیں سبق دیتی ہے کہ بہترین مسلمانوں کے مقابلے میں وہ دشمن جنگ جیتے جن کے پاس مسلمانوں سے برتر اسلحہ تھا۔ مثلاً سید احمد شہید کے مقابلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی جنگ جیت گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے مقابلے میں انگریز کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ اسی طرح کی بیسیوں مزید مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پچھلے تین سو برس کے واقعات سے طالبان اور پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے قائدین نے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔

لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ جب آپ کے پاس سامان حرب کی کمی تھی تو آپ نے ہمیشہ لڑائی کو ٹال کر مسلمانوں کو بچایا۔ اس کی سب سے نمایاں مثال جنگ احزاب ہے۔ اس وقت دشمنوں کی تعداد دس ہزار جب کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی۔ مزید یہ کہ دشمن کے پاس اسلحہ بہت بڑی مقدار میں تھا۔ چنانچہ نبی کریم نے مقابلہ کرنے کے بجائے مدینہ کے گرد خندق کھود کر اس کے اندر مسلمانوں کو محصور کر کے انھیں دشمن سے بچایا۔ سوال یہ ہے کہ کیا طالبان نے حضور کی سیرت سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔

طالبان کی دوسری دلیل بہت کمزور تھی۔ اگر وہ القاعدہ کے ارکان کو امریکہ کے حوالے کر دیتے تب پوری دنیا کی اخلاقی ہمدردیاں طالبان کے ساتھ ہو جاتیں۔ امریکہ چاہنے کے باوجود اقوام متحدہ سے طالبان کے خلاف کوئی اور قرارداد حاصل نہ کر سکتا۔ خود امریکہ کے اندر رائے عامہ حکومت کے خلاف ہو جاتی۔ اور اگر بالفرض امریکہ پھر بھی شرارت کی کوشش کرتا تو اس کی ہر چال کا حکمت وسیاست کے ساتھ توڑ کیا جا سکتا تھا۔

طالبان کی تیسری دلیل یہ تھی کہ ثبوت کے بغیر وہ بن لادن کو قطعاً امریکہ کے حوالے نہیں کریں گے۔ خواہ اس کی کوئی بھی قیمت ان کو ادا کرنا پڑے۔ اس دلیل میں چند اہم غور طلب پہلو ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ امریکہ کے خیال میں یہ اس کے لیے ممکن اور مناسب نہیں تھا کہ وہ طالبان کو اس کے بارے میں ثبوت فراہم کرتا۔ اس کے لیے اس کے تجزیے کے مطابق طالبان حکومت اور القاعدہ ایک ہی سکے کے دو رخ تھے۔ ان کو ثبوت فراہم کرنا اور پھر القاعدہ کے متعلق ان پر فیصلہ چھوڑنے کا مطلب دراصل ملزم کو عدالت کے حوالے کرنا تھا۔ البتہ امریکہ نے وزیر خارجہ کولن پاول کے ذریعے سے یہ کھلی پیش کش کر دی کہ بن لادن پر کسی دوسرے غیر جانب دار ملک میں اس ملک کے قانون کے مطابق مقدمہ چلایا جائے تو یہ امریکہ کو منظور ہوگا۔ لیکن اس پیش کش کو طالبان نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ دنیا بھر میں شرعی عدالت تو صرف طالبان کی ہے، اس لیے بن لادن کے متعلق اسی کا فیصلہ چلے گا۔ واضح رہے کہ گیارہ ستمبر سے پہلے خود ملا عمر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ تین مسلمان ملکوں پر مشتمل ایک عدالت بنائی جائے جس کے سامنے بن لادن کو پیش کیا جائے۔ جب گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانی علما کا ایک وفد ان سے ملاقات کے لیے قندھار گیا اور وہاں مفتی شامزیٰ نے اسی تجویز کا اعادہ کرنے کو کہا تاکہ اس کی بنیاد پر بات آگے بڑھائی جا سکے تو ملا عمر نے اپنی تجویز کا اعادہ کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب بن لادن پر صرف طالبان کی عدالت میں ہی مقدمہ چل سکتا ہے۔

امریکہ کا یہ کہنا تھا کہ بن لادن کے خلاف ثبوت اتنی حساس نوعیت کے ہیں کہ انھیں ذمہ دار ترین حکومتوں اور مجاز عدالتوں کے علاوہ کسی کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ القاعدہ کا ۲۳ فروری ۱۹۹۸ کا تحریری اعلان جنگ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ اس کے ذمہ دار افراد کو مجاز عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔

بدقسمتی سے گیارہ ستمبر کے واقعات کے بعد بن لادن اور القاعدہ کے دوسرے اہم رہنما اپنے ہر بیان اور ہر انٹرویو کی وجہ سے اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے گئے۔ مثلاً بن لادن نے بارہ ستمبر کو اپنے ایک بیان میں حملہ آوروں کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تائید کی۔ سات اکتوبر کے بیان میں انھوں نے کہا کہ حملہ آور بہت اچھے نوجوان مسلمان تھے جن کو پروردگار نے اس حملے کی توفیق بخشی اور جنت کی ابدی نعمتیں ان کا انتظار کر رہی ہے۔ تیرہ اکتوبر کو القاعدہ کے ترجمان نے الجزیرہ ٹی وی پر کہا کہ مغرب کے اندر رہنے والے مسلمانوں کو اونچی عمارتوں میں رہنے اور ہوائی سفر سے گریز کرنا چاہیے اس لیے کہ اس طرح کے مزید خود کش حملے بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد بن لادن نے اپنے ایک مبینہ انٹرویو میں نیوکلیر، کیمیائی اور حیاتیاتی ہتھیار رکھنے کا دعویٰ کیا۔ اس طرح اس نے اپنے خلاف ایکشن کے لیے دنیا بھر کو ایک بھرپور اخلاقی جواز فراہم کر دیا۔

اس معاملے کا اگلا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے اندر ایسا کوئی اصول ہی نہیں جس کے تحت چند افراد کے لیے ایک پورے ملک، ایک حکومت اور ہزاروں مسلمانوں کو موت کے منہ میں جانے دیا جائے۔ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کیا جاتا تو اس

کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت تھے بھی یا نہیں۔ اول تو یہ مقدمہ کئی برس تک چلتا پھر کہیں جا کر سزا کی نوبت آتی۔ لیکن دوسری صورت میں تو سب بشمول القاعدہ کی تباہی یقینی تھی۔ ایسے موقع پر اسلام نے ہمیں حکمت کا اصول سکھلایا ہے جس کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے موقع پر دشمن کی یہ شرط تسلیم کر لی تھی کہ اگر مدینہ سے کوئی فرد دشمن کے ہاں جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا اور اگر دشمن کے ہاں سے کوئی فرد مدینہ آجائے تو مسلمان اسے واپس کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ طالبان کی یہ دلیل بھی انتہائی کمزور، بلکہ مہلک تھی۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ طالبان کو فیصلہ کن شکست ہوئی۔ افغانستان میں تباہی کی ایک اور داستان رقم ہوگئی۔

سوال یہ ہے کہ افغانستان کے معاملے میں اب کیا کیا جائے۔ درحقیقت اس کا حل خود افغانوں کے پاس ہے۔ آج اس امر کی ضرورت ہے کہ افغانستان کے اندر تمام سابقہ طالبان کرزئی حکومت کے خلاف مسلح اقدامات ختم کر دیں۔ اور اپنے آپ کو ایک سیاسی تنظیم میں ڈھال لیں۔ تمام مقامی کمانڈر اپنی اپنی افواج کو افغان فوج میں ضم کر لیں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ امریکی افواج سے افغانستان چھوڑنے اور کرزئی حکومت سے انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا جائے۔ اور پھر ان دونوں کو یہ مطالبہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

پاکستان کے لیے ان حالات میں صحیح پالیسی یہ ہے کہ افغانستان سے ملحق تمام قبائلی علاقوں کی خصوصی حیثیت ختم کر کے انھیں صوبہ سرحد کا حصہ بنا دیا جائے اور وہاں قانون کی پوری عمل داری یقینی بنائی جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان افغانستان کے اندرونی معاملات سے اپنے آپ کو بالکل لاتعلق کر دے۔ اور کرزئی حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرے۔ صرف اسی طریقہ سے وہاں پاکستان کے خلاف موجودہ نفرت کی فضا کم ہو سکتی ہے۔

حکومت پاکستان کی نائن الیون سے پہلے اور بعد کی دونوں پالیسیاں خود غرضی اور بے اصولی پر مبنی تھیں۔ نائن الیون سے پہلے وہ طالبان کی کھلی حمایت کر رہی تھی، حالانکہ ایسا کرنا غلط تھا اور نائن الیون کے بعد امریکہ کے دباؤ پر اس نے اپنی پالیسی مکمل طور پر بدل کر اور امریکہ کی ہر بات بے چون و چرا مان کر ایک اور غلط کام کیا۔ خصوصاً امریکہ کو اپنے ہوائی اڈے حوالے کرنے اور اسے لاجسٹک مدد فراہم کرنے کا فیصلہ ہر اعتبار سے غلط تھا۔ پاکستان کو آیندہ اس طرح کی بے اصولی اور بے حکمتی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خورشید احمد ندیم

نواب زادہ نصر اللہ کی جانشینی

نواب زادہ نصر اللہ خان ہماری اس روایت کے آخری آدمی تھے جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں جنم لیا اور بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں اپنے کمال کو پہنچی۔ اس جملے میں ''آخری'' کا لفظ زمانی اعتبار سے استعمال ہوا ہے اور جوہری اعتبار سے بھی۔ علم، فضل، متانت و شایستگی، شعر و سخن، گفتار و خطابت، کسی زاویے سے دیکھیے، اس عرصۂ وقت میں ہمارے بزرگوں نے، محسوس ہوتا ہے کہ بام عروج کو چھو لیا تھا۔ ابوالکلام، ابوالاعلیٰ، امین احسن اور ان سے ذرا پہلے محمود حسن، علامہ اقبال، حمید الدین فراہی اور اگر مزید پیچھے جائیں تو شبلی اور سرسید۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سطح کے لوگ چشم فلک نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔ یہ اگر مذکورہ صفات کے اعتبار سے سیڑھی کے آخری قدم پر کھڑے تھے تو ہمارے نواب زادہ پہلے پر۔ اس کے باوجود، المیے کی انتہائی دیکھیے کہ ہماری صفوں مین اب ایک بھی ایسا نہیں، جسے ان کی مسند پر بٹھایا جا سکے:

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

نئی نسل ہماری تاریخ کے ادھورے سچ سے واقف ہے۔ وہ قائداعظم اور مسلم لیگی تشخص رکھنے والی شخصیات کی عظمت کو جانتی ہے، لیکن اس گلستان سے باہر کھلے پھولوں کی مہک اس تک بہت کم پہنچی ہے۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ چمن میں ہونے کے باعث کچھ خاروں کو بھی پھول سمجھ لیا گیا، ورنہ قائداعظم، بہادر یار جنگ یا لیاقت علی خان جیسے لوگ آخر اس قافلے میں بھی کتنے تھے؟ نواب زادہ صاحب کی جن خوبیوں کا آج ذکر ہے، اس کا ماخذ مسلم لیگ میں نہیں، کہیں اور ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ سے صحیح طور پر واقف ہو سکیں تو نواب زادہ صاحب کی رخصتی کا دکھ دو چند ہو جائے۔

ایسا کیوں ہوا کہ سیاست میں شایستگی اور متانت کی روایت دم توڑ گئی؟ نواب زادہ صاحب کو یہ صدمہ بار ہا کیوں سہنا پڑا کہ فارسی کا کوئی خوب صورت شعر ان کے لبوں تک آ کر لوٹ گیا کہ ان کے سامعین میں کوئی شعر شناس نہیں تھا؟ نواب زادہ کا

جانا ایک سانحہ ہے ہی، اس سے بڑا حادثہ ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ہم اپنی روایت سے کٹ گئے ہیں، وہ روایت جس پر فخر کیا جانا چاہیے تھا۔ آج نواب زادہ صاحب کی جانشینی کے لیے جو شخص سب سے موزوں دکھائی دیتا ہے، اس کا معاملہ بھی یہ ہے کہ گزشتہ تیس برسوں میں اس کے ہاں کوئی ذہنی اور فکری ارتقا نہیں آیا۔ اب دوسروں کا کیا حال ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جس حد تک میں سوچ سکا ہوں، اس قحط الرجال کے دو بڑے اسباب ہیں: ایک سبب تو جمہوریت کا نہ ہونا ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ فوج کے مسلسل اقتدار میں رہنے سے ہمارے ہاں ایسے ادارے نہیں بن سکے جو نئی نسل کے لیے تربیتی مرکز کا کام دیتے۔ پارلیمنٹ اور انتخابی عمل، دونوں افراد کے جمہوری رویوں کی تعمیر کرتے ہیں۔ پھر جمہوری کلچر میں جب لکھنے اور بولنے کی آزادی ہوتی ہے تو باصلاحیت لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس بات کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ باصلاحیت لوگ ہی کسی تہذیبی روایت کو آگے بڑھا سکتے اور اس کے ارتقا کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ادارے چونکہ انسانی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہیں، اس لیے فوجی آمر مصنوعی طور پر ایسے ادارے بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ زندگی کی نشو ونما کا تاثر دیا جا سکے۔ اس دوران میں سیاست کے دروازے ان لوگوں پر بند ہو جاتے ہیں جو اس کے لیے فطری داعیہ رکھتے ہیں۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے مصنوعی سیاست دان تراشے جاتے ہیں۔ اسی طرح شعر و ادب میں تخلیقی رجحان رکھنے والے پس پردہ چلے جاتے ہیں یا پس دیوار زنداں اور ان کی جگہ درباری شعرا اور ادیب شاہ کے مصاحب بنتے اور اترانے لگتے ہیں۔ یہ عمل ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ جب ایک طویل عرصہ جاری رہتا ہے تو دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگ ہر میدان میں نمایاں ہو جاتے ہیں اور اداروں کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ آپ موجودہ پارلیمنٹ کو دیکھیے! جنرل ضیاء الحق مرحوم کی مجلس شوریٰ سے ایک عمل شروع ہوا جب مستند سیاست دانوں ی جگہ مصنوعی سیاست دان پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ اس کے بعد انتخابی عمل پر جس طرح کی قدغنیں رہیں، اس کے نتیجے میں ہر اسمبلی اس مجلس شوریٰ کی جانشین بنی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ گویا نئے سیاست دان ڈھالنے کا عمل ایک حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ اب اگر نواب زادہ نصر اللہ جیسے افراد کبھی پارلیمنٹ تک نہ پہنچ سکیں گے تو لوگ کیسے جانیں گے کہ شایستگی کے ساتھ تنقید کیسے ہو سکتی ہے اور عصری موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اپنی شعری روایت سے کیسے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ عقابوں کے نشیمن جب زاغوں کے تصرف میں آئے تو پھر اس کا وہی انجام ہوا جو ہونا تھا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے ہان سیاسی جماعتوں نے داخلی سطح پر کوئی ایسا اہتمام نہیں کیا جس کا مقصد کارکنوں کی تربیت ہو۔ پاکستان کے مقابلے میں بھارت نے اگر جمہوری اعتبار سے شعوری پختگی کا مظاہرہ کیا ہے تو اس کا سبب وہاں کی سیاسی جماعتوں کا جمہوری کلچر ہے۔ مثال کے طور پر کانگرس میں ضلعی سطح پر ان افراد ہی کو عہدہ دیا جاتا ہے جو صوبائی سطح پر عہدے دار رہ چکے ہوں۔ اس طرح یہ شرط مرکزی مجلس تک برقرار رہتی ہے۔ اس سے تربیت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کا ایک خود کار نظام وجود میں آتا ہے۔ کچھ یہی معاملہ روس اور پھر چین کی کمیونسٹ جماعتوں کا بھی تھا۔ ہمارے ہاں جماعت اسلامی کی صورت میں ایک استثنا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے لوگوں نے یہ شعوری کوشش کی کہ شایستگی اور متانت کی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے سیاسی تربیت کا ایک نظام بنایا جائے۔ اس کے نتائج نکلے اور آج اگر معاصر اہل سیاست میں اس کی تھوڑی بہت جھلک کہیں دکھائی دیتی ہے تو وہ جماعت اسلامی کے ہاں ہی ہے۔ آج اگر سینٹ میں ڈیسک بجاتے اور نعرے لگاتے ہوئے پروفیسر خورشید احمد کو تکلف اور جھجک محسوس ہوتی ہے تو یہ اسی نظام تربیت کا اثر ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے علاوہ ہماری پچھلی نسل کے کسی دوسرے فرد نے اس طرح کی کوشش نہیں کی، نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اگر ریاستی ادارے فطری طور پر آگے بڑھتے تو تربیت کا ایک خود کار نظام وجود میں آجاتا۔ ایک طرف فوجی مداخلت کے باعث یہ نظام قائم نہ ہو سکا اور دوسری طرف سیاسی جماعتوں کے ہاں بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے بعد نواب زادہ نصراللہ کا جانشین کہاں سے پیدا ہوتا۔

دوسرا سبب سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی غیر معمولی شخصیت کا ظہور ہے۔ انھوں نے عوام کو زبان دینے کے نام پر جس سیاسی کلچر کی بنیاد رکھی، اس میں شایستگی اور متانت کے سوا آپ سے کچھ تلاش کر سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب کی عوامی مقبولیت نے نئے سیاست دانوں میں ان کے اندر سیاست کو شہرت بخشی اور یہ خیال کیا گیا کہ عوامی سطح پر مقبول ہونے کا یہی سب سے بہتر اور مختصر راستہ ہے۔ یہ کلچر کچھ اس طرح پھیلا کہ مولانا مودودی کا تربیتی نظام بھی اس کی زد میں آ گیا۔ بھٹو صاحب سیاست میں کچھ اور چیزیں لے کر بھی آئے تھے۔ مثال کے طور پر وہ ایک وسیع المطالعہ آدمی تھے، جن کی دنیا کی سیاسی تاریخ پر ایک نظر تھی۔ اس کے علاوہ وہ انگریزی زبان کا اچھا ذوق رکھتے تھے جس کا اظہار ان کی تقریروں اور تحریروں، دونوں سے ہوا۔ اس پر مستزاد ان کی بے پناہ ذہانت۔ ہماری بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان کی خوبیوں کی جانشینی کے لیے کوئی آمادہ نہ ہوا، البتہ شایستگی اور متانت کا جنازہ بہت اہتمام سے نکالا گیا۔

یہ اسباب جب تک باقی ہیں، ہمیں نوب زادہ نصراللہ کا جانشین نہیں مل سکتا، بلکہ ہمیں شاید کوئی دوسرا راجہ ظفرالحق بھی نہ مل سکے۔ قحط الرجال کے اس مسئلے سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری عمل اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھے اور سیاسی جماعتیں اس طرح منظّم ہوں کہ ان کے ہاں افراد کی سیاسی و تہذیبی تربیت کا پورا اہتمام ہو۔ اس مقصد کے لیے اگر قانون سازی کی جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نواب زادہ نصراللہ، ابوالکلام اور عطاءاللہ شاہ بخاری جیسے لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر پودا افزایش کے لیے ایک خاص فضا چاہتا ہے۔ ہم جس سیاسی فضا میں زندہ ہیں، وہ کسی نواب زادہ نصراللہ کی نشوونما کے لیے سازگار نہیں ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ڈاکٹر صاحب زادہ انوار احمد بگوی

فکر اصلاحی کا امین

[یہ تقریر خالد مسعود صاحب کی یاد میں منعقدہ تعزیتی اجلاس میں کی گئی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آج کی شام ہم یہاں ایک عالم کا ماتم کرنے جمع ہوئے ہیں۔ عالم بھی وہ جوام الکتب قرآن حکیم کا عالم تھا۔ ایسا عالم جو پورے فہم وشعور اور تقویٰ وخشیت کے ساتھ قرآن پر عمل پیرا تھا۔ جس نے برصغیر، بلکہ علام اسلام کے فہم قرآن کے سب سے بڑے اور تازہ سرچشمے سے قرآن اور حدیث کا علم حاصل کیا، انتہائی لگن، گہرے خلوص اور فہم خالص کے ساتھ، کسی آمیزش یا تعصب کے بغیر۔

اگرچہ امام امین احسن اصلاحی کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ خود علامہ خالد مسعود کے بیسیوں شاگرد تھے۔ مگر وہ اپنے جلیل القدر استاذ امام کے مانند ہمیشہ قرآن کے طالب علم اور محقق رہے۔

علامہ بنیادی طور پر کیمسٹ تھے اور اپنے پیشے سے بہت مخلص، شاید اسی لیے مبداء فطرت نے انھیں نسخۂ کیمیا پانے کا راز بتا دیا۔ اور ایک اچھے کیمیا گر کی طرح خالد مسعود پھر اس ایک راہ کے ہو لیے۔

علامہ مرحوم کی شخصیت ان پانچ خصائل سے ممتاز تھی:

متانت، وقار کے ساتھ،

شرافت، خشیت کے ساتھ،

دیانت، امانت اور راستی کے ساتھ،

عزیمت، مسکراہٹ اور صبر کے ساتھ، اور

قرآنی علوم کی اشاعت اور استاذ امام سے محبت، استقامت کے ساتھ۔

ان کی زندگی سادگی، اخلاص، پاکیزگی اور بے ریائی سے عبارت تھی۔

بطور سرکاری آفیسر جب لاکھوں کی خریداریاں ان کے ہاتھوں سے گزرتی تھیں تو انھیں خدا کی رضا، عدل وانصاف اور ملک کا مفاد عزیز رہتا۔ دوران ملازمت میں ان کا ایک یادگار معرکہ، ایک شعبے کے کرپٹ سربراہ سے مجادلہ اور اسے سروس سے نکلوانا تھا۔ آج چونکہ حکمرانوں کی طرح سرکاری ملازمین میں بھی ایک سے ایک بڑا فنکار ہے، خیر وشر کے پیمانے بدل گئے ہیں، اس لیے اب ملازم لوگ تنازع کے بجائے ''اتفاق للبقاء'' کے کارآمد اصول پر کاربند ہیں۔

محکمہ انڈسٹریز کی ریسرچ برانچ ختم ہو جانے کے بعد، استاذ امام کی عنایت سے وہ قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور میں بطور علمی محقق تعینات ہوئے۔ وہاں انھوں نے سائنسی مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا مفید کام سرانجام دیا اور ان کی متعدد کتابیں اور رسالے شائع ہوئے۔

بطور معلم ان کی زبردست یادگار ''اسباق النحو'' ہے جس نے طالبان علوم قرآنی کے لیے عربی سیکھنے کی راہ آسان بنا دی ہے۔ بطور محقق، مصنف اور قرآن حکیم کے طالب علم کے ان کی حالیہ معرکۃ الآرا کتاب ''حیات رسول امی'' ہے جو اصل میں قرآن کے فراہی اور اصلاحی فکر کی آئینہ دار ہے۔ اس کتاب کی طباعت تب ہوئی جب وہ جناح ہسپتال لاہور کے میڈیکل وارڈ کے بستر پر دراز تھے۔ ان کی مسرت اور طمانیت کا یہ شاید ان مٹ لمحہ تھا۔

جریدہ ''تدبر'' علامہ مرحوم کی فکر اصلاحی وفراہی سے لازوال عقیدت ومحبت، ان کی مخلصانہ محنت اور ہم سخن احباب کے مسلسل ٹیم ورک کا نمونہ ہے۔ استاذ امام اصلاحی کے بعد، علامہ خالد مسعود مرحوم اور ان کے ساتھیوں اور شاگردوں نے مولانا فراہی کے افکار، مولانا اصلاحی کے نظریات اور قرآن کے اساسی فکر کو عام کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ ان سارے کاموں میں بلاشبہ مرکزی اور 'Driving force' علامہ مرحوم کی ذات تھی۔ انھوں نے اس مختصر، مگر توانا اور صاف آواز کو ایک معیار اور تسلسل کے ساتھ جاری رکھا ہے۔

علامہ خالد مسعود مرحوم ان تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بہرہ ور تھے جن کے سبب سے وہ پاکستان میں فکر اصلاحی کے امین تھے اور استاذ امام اصلاحی کے بے پناہ اور بھرپور اعتماد کے وارث۔

ان کی شخصیت پر مولانا کا نہایت گہرا اثر تھا۔ تصوف کی اصطلاح میں وہ فنا فی الاصلاح کے درجہ پر فائز تھے۔ ان کی محبت اور گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ کسی اور حلقے یا فرد کے لیے مولانا تک رسائی کے لیے پہلے انھیں عبور کرنا پڑتا تھا۔ مولانا اصلاحی کے بڑھاپے اور علالت میں ان کے دروس حدیث، اپنی علمیت اور افادیت کے اعتبار سے باکمال تاریخی خدمت ہے۔ مولانا سے نچوڑ نچوڑ کر علم وحکمت حاصل کرنے اور اسے مدون کرنے اور پھیلانے میں علامہ خالد مسعود مرحوم کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔

استاذ امام اصلاحی رحمہ اللہ سے علامہ خالد مسعود مرحوم کا تعلق نصف صدی کا قصہ ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تاریخ اسلام کی زندہ رہنے والی اورعظیم الشان تفسیر ''تدبر قرآن'' پچھلی صدی ، بلکہ ہزاریے کا بہترین تحفہ ہے۔اس شان دار کتاب کی سطر سطر، اس کا لفظ لفظ علامہ کی نظروں سے گزرا ہے، وہ اس کتاب سے متعلق ہر ہر 'Development' کے شاہد عادل تھے۔

اس عظیم اور تاریخی سعادت میں استاذ امام اصلاحی کا کوئی اور شاگرد یا عزیز علامہ کا شریک نہیں ہے۔

جانا تو ہر جی کا مقدر ہے

علامہ خالد مسعود مرحوم آن سے جیے اور شان سے گزر گئے۔

اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں ان پر، اللہ ان سے راضی ہو۔

البتہ وہ دین جو بڑی شان سے ابھرا تھا اور کسی وقت دنیا کی عظیم المرتبت عسکری، علمی اور تہذیبی قوت بنا، آج اس کے نام لیوا گھمبیر نکبت وادبار اور ہر نوع کے تنزل اور ناکامی سے دوچار ہیں۔ بھرپور مادی وسائل کے باوجود اتنی بے بسی۔ کثیر آبادی اور وسیع سرزمین کے باوصف اس قدر بے وقعتی اور لاچاری۔ آج عالم اسلام تاریخ کے سب سے بڑے طاغوت، شیطان اور دہشت گرد کی ٹھوکروں میں ہے۔ اس کی واحد بڑی وجہ قرآن سے دوری اور اس کا موثر حل رجوع الی القرآن اور خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے میں ہیں۔

جناب صدر○! ایک مدت سے آپ بھی وہی کام کر رہے ہیں جو علامہ خالد مسعود مرحوم گزشتہ نصف صدی سے کر رہے تھے۔

جب مقاصد اور منہج اور سرچشمہ ایک ہی ہے تو پھر ''ادارۂ تدبر قرآن وحدیث'' اور ''المورد'' کو باہمی تعاون کرنا چاہیے تاکہ قرآن کی تعلیمات اور ان کا فہم عام ہو اور مسلمان پھر سے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ علامہ مرحوم کے درجات بلند کرے۔

ان کی محنتوں اور قربانیوں کو قبول فرمائے اور ان کے مشن کو جاری رکھے۔

○ جاوید احمد غامدی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معظم صفدر

”آئینۂ کردار“

مصنف: ڈاکٹر زاہد منیر عامر،

ضخامت: ۱۱۲ صفحات،

قیمت: ۸۰ روپے،

ناشر: شیخ زاید اسلامک سنٹر، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دین کا مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ وہ انسان کے نفس کو غیر اخلاقی آلایشوں سے پاک کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ خدا کی بنائی ہوئی اس جنت کا حق دار قرار پا سکے جو پاکیزہ نفوس کے لیے خاص ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ اپنے اخلاقی وجود پر دھیان نہ دے تو طرح طرح کی آلایشیں اس کے نفسی وجود کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں خیر و شر کا شعور ودیعت کیا ہے۔ اس کی بدولت انسان جھوٹ، فریب، غیبت، چوری اور ظلم جیسے رویوں کی بدی جبکہ سچ، ایمان داری، خیر خواہی، عدل اور رحم جیسے رویوں کو نیکی سمجھتا ہے۔ انبیاے کرام کی دعوت بھی اس امر کی عکاس ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اعلیٰ اخلاقی رویوں کو اپنانے اور غیر اخلاقی رویوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ انسانوں میں صبر، شکر، اخلاص، استقامت، پاکیزگی، ایثار، ہمدردی، خیر خواہی اور شایستگی جیسے اوصاف پروان چڑھاتے ہیں۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو اس کے نفسی وجود کو اخلاقی آلایشوں سے پاک رکھتے ہیں۔

اخلاق کیا ہے؟ معاشرتی لحاظ سے اس کی کیا اہمیت ہے؟ قوموں کے عروج و زوال میں اسے کیا حیثیت حاصل ہے؟ انفرادی سطح پر اس کے کیا تقاضے ہیں؟ زیر تبصرہ کتاب ”آئینۂ کردار“ ایسے ہی مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں فلسفۂ اخلاق پر بحث کی گئی ہے۔ یہ موضوع چونکہ براہ راست اسلام سے متعلق ہے،

اس لیے اس ضمن میں قرآن مجید سے بھرپور رہنمائی لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے قدیم مذاہب کی تاریخ اور عظیم فلسفیوں کے اخلاقی نظریات سے بھی استفادہ کیا ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک اخلاق ایسے بے بس اور مجبور لوگوں کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے جو ظلم اور جبر کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ''آئینۂ کردار'' کے مصنف کے نزدیک یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ اس ضمن میں ان کا استدلال اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر مجرم اپنے جرم کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے جرم کی شناخت سے خود باخبر ہوتا ہے۔ ''گم شدہ کی تلاش'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

> ''اگر یہ بات درست ہے کہ اخلاق، طاقت وروں کو نیچا دکھانے کے لیے کم زور لوگوں کی ایک اختراع ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں بد اخلاق سے بد اخلاق شخص، ظالم سے ظالم فرد یا حکومت اور بدترین ناانصافیاں کرنے والے بھی اپنے کاموں کے جواز کے لیے اخلاقی دلائل کیوں تلاش کرتے ہیں؟ کج خلقوں، ظالموں اور ناانصافوں کی یہ تلاش ہی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اخلاق و کردار زندگی کی بنیادی اقدار میں سے ہیں جنھیں گزرتے ہوئے وقت کے نقوش دھندلا نہیں سکتے۔'' (۱۳)

مصنف کے نزدیک نفسیات اور اخلاقیات کے ماہرین نے انسان کے اعمال کو کرداری اعتبار سے طبیعت، حال اور ملکہ سے متعلق قرار دیا ہے۔ طبیعت سے مراد انسان کی ناقابل تغیر جبلت ہے۔ انسان کی متغیر اور اثر پریز کیفیت کو حال قرار دیا جاتا ہے، جبکہ ملکہ انسانی نفس کی اس کیفیت کو کہا جاتا ہے جو رسوخ پانے میں کامیاب ہو جائے۔ مصنف کے مطابق ماہرین نے اخلاق کو دائرۂ ملکہ میں رکھتے ہوئے فطری حدود میں ہونے والے اعمال کو اخلاق حسنہ، جبکہ اس حدود سے تجاوز کرنے والے اعمال کو اخلاق سیۂ کے زمرے میں رکھا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اخلاق کی تربیت و تطہیر ایک خارجی ہی نہیں، بلکہ داخلی ضرورت بھی ہے۔ وگرنہ انسان کے اندر ہونے والی کشمکش اسے نہ صرف ایک غیر مفید شہری بنائے گی، بلکہ اسے ذات کی وحدت و بقا سے بھی بے گانہ کر دے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مصنف کے نزدیک دنیا کی بے ثباتی اور یوم حساب کو ہر لحظہ پیش نظر رکھنے والوں کے لیے راہ حق پر قائم رہنا، دشوار امر نہیں ہے۔ دینوی پریشانیوں اور مشکلات کو اگر آزمایش کے تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو تمام تکالیف سہل نظر آنے لگتی ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''متاع دنیا قلیل ہے اور آخرت، اہل تقویٰ کے لیے بہتر ہے جہاں عمل کرنے والوں کو ان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا اجر ملے گا اور ایک تاگے کے برابر بھی ان کا حق نہیں رکھا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو شخص عقیدۂ توحید کو قبول کرے گا اس کے پیش نظر آخرت اور روز حشر کا حساب ہوگا، آخرت کی میزان کا تصور اسے ظلم و زیادتی سے باز رکھے گا اور رفتہ رفتہ اس کے اخلاق و کردار میں نیکی، نرمی، رافت، برداشت، عدل، انصاف، احسان کی محبت گھر کر جائے گی اور وہ فواحش منکرات اور حدود سے تجاوز کرنے کے رویوں کو ناپسند کرنے لگے گا۔ جب یہ پسند و ناپسند طبیعت میں راسخ ہو جائے گی تو اسے نیکی اور حسن خلق کا ملکہ حاصل ہو جائے گا، اور یہی ملکہ رفتہ رفتہ اس کے ہاں حسن کردار کے بے تکلف ظہور کا سبب بن

جائے گا، پھر اسے معاشرتی زندگی میں خوبی کردار کو اپنانے کے لیے کسی خارجی منفعت ومضرت پر نظر رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ وہ اپنے اعمال کا تعین وقتی حالات وواقعات کی روشنی میں نہیں کرے گا۔ دیانت روی، عدل وقسط اور احسان اس کی پالیسی نہیں ہوں گے، بلکہ ان سب کا صدور اس کی طبیعت کا اقتضا بن کر ہونے لگے گا اور اس کا عمل اخلاق فاضلہ کا ایک حسین نمونہ بن جائے گا۔''(۵۳)

باب دوم میں ''چند کرداری مباحث'' کے زیرعنوان اعلیٰ اخلاقی رویوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مختلف موضوعات پر مختصر مضامین عام فہم اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں اخلاص، استقامت، صبر، پاکیزگی، مطابقت، تشکر، سفارش اور کامیابی کے موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

''اخلاص'' کے زیرعنوان مصنف نے نہایت سادہ اسلوب میں شرک کی آلودگیوں سے بچنے کی ترغیب دی ہے۔ کائنات کی خوب صورتیوں سے بات شروع کر کے عشق مجازی اور پھر عشق حقیقی کی جانب غیرمحسوس طریقے سے توجہ کرائی گئی ہے۔ عشق مجازی کی اساسات اور ٹھکرائے جانے کے بعد کے احساسات بیان کرنے کا مقصد قاری پر اس دنیا کی بے ثباتی ظاہر کرنا ہے۔ مصنف چونکہ بنیادی طور پر ادیب ہیں، اس لیے انھوں نے نہایت خوبی کے ساتھ فلسفہ واخلاق کے مضامین کو ادبی پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ان کا یہ اسلوب قاری کو متوجہ رکھتا ہے۔ خلوص نیت سے صرف اور صرف اللہ کے لیے خاص ہو جانے کے لیے اپنی تحریر میں امیر خسرو کا یہ شعر اس خوب صورتی سے نقل کیا ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی:

نہ یک دل درد و دلبر رہ کند گم
نہ در یک دیدہ درگنجد دو مردم

(ایک دل دو محبوبوں میں گم ہوسکتا ہے نہ ایک آنکھ کے اندر دو پتلیاں ہوسکتی ہیں۔)

''استقامت'' کے عنوان کے تحت اس زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد ان پر انسانی ردعمل کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ زندگی چونکہ آزمایش سے عبارت ہے، اس لیے درپیش مشکلات کو آزمایش کے اصول پر دیکھتے ہوئے جب انسان استقامت کا رویہ اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین محکم رکھتا ہے تو وہ نہ صرف اس دنیا میں ایک مطمئن زندگی بسر کرتا ہے، بلکہ اخروی زندگی میں کامیابی کا امیدوار قرار پاتا ہے۔

روایتی اسلوب سے ہٹ کر جہاں مصنف نے قرآن مجید سے بھرپور رہنمائی لی ہے، اسی طرح انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ''صبر'' کے تحت لکھتے ہیں:

''کامیابی اور کامرانی کی کیفیتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر کی تصویر بنے رہے۔ فتح مکہ جیسے کامیابی کے بے مثال واقعے پر بھی آپ نے انتقام کا راستہ اختیار نہیں فرمایا۔''(۷۷)

انسان کے ظاہر اور باطن، دونوں کو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک صاف ہونا چاہیے، لیکن ایک مخصوص مکتب فکر کے لوگ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

باطنی طہارت کے شوق میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ ارشاد نبوی ''اپنے کپڑے پاک صاف رکھو اور گندگی سے دور رہو'' سے بھی صرف نظر کر بیٹھے۔ اس بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''ظاہر کی پاکیزگی سے دل و دماغ کی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ دل و دماغ پاکیزہ ہوں گے تو انسان کے خیالات، تصورات، جذبات اور احساسات پاکیزہ اور راست ہوں گے۔ یہ پاکیزگی اور راستی کامیابی کی ضمانت بن جائے گی۔'' (۸۱)

کسی بھی معاشرے میں اخلاقی اقدار کے معیار کا اندازہ شہریوں کے قول و فعل میں مطابقت سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس! آج ہمارا معاشرہ قول و فعل کی عدم مطابقت کا شکار ہے، عام شہری سے لے کر ارباب دانش تک، سبھی لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ مصنف نے اس خرابی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نقل کی ہے:

''تم دوسروں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۴۴)

''کامیابی'' کے عنوان سے مصنف نے دنیا کی بے ثباتی کو سادہ، مگر پرتاثیر الفاظ میں واضح کیا ہے۔ مصنف کے نزدیک اللہ اور اس کے رسول کی ہر حال میں اطاعت کرنے والے مومن اور متقی لوگوں ''کامیاب'' ہیں۔ کامیابی کے مفہوم کو واضح کرنے کے بعد مصنف کا انسان کے کامیاب ہونے کی فطری سعی کو زیر بحث لانے کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ انسان اس دنیا کی حقیقت کو جان لے اور ''اخروی کامیابی'' کے لیے تگ و دو کرے۔ مصنف رقم طراز ہیں:

''جنھوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑ دیے، جان و مال سے جہاد کیا جو ایک دوسرے مومن کے رفیق کار بنے، نماز قائم کی، زکوٰۃ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی۔

ایسے دوستوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں بشارت ہی بشارت ہے، دنیا کی مسرتوں کے ساتھ ان کے لیے آخرت میں ایسے باغ تیار کیے گئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں اور ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی۔'' (۱۰۷)

موضوع کے اعتبار سے یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ مصنف کا طرز تحریر دل نشین ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ خالص فنی مباحث کو بھی وہ انتہائی سلاست سے بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ معاشرہ اس وقت جس اخلاقی انحطاط کا شکار ہے، اسے دیکھ کر یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ایسی کتابوں کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معظم صفدر

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۳ء

قرآنیات

جنوری	البقرہ(۲:۲۳۰_۲۳۲)	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۳
فروری	〃 (۲:۲۳۳_۲۳۵)	〃	〃	۵
مارچ	〃 (۲:۲۳۶_۲۳۷)	〃	〃	۵
اپریل	〃 (۲:۲۳۸_۲۴۲)	〃	〃	۷
مئی	〃 (۲:۲۴۳_۲۴۵)	〃	〃	۵
جون	〃 (۲:۲۴۶_۲۴۸)	〃	〃	۵
جولائی	〃 (۲:۲۴۹_۲۵۶)	〃	〃	۷
اگست	〃 (۲:۲۵۷_۲۵۸)	〃	〃	۷
ستمبر	〃 (۲:۲۵۹_۲۶۰)	〃	〃	۷
اکتوبر	〃 (۲:۲۶۱_۲۶۴)	〃	〃	۵
نومبر	〃 (۲:۲۶۵_۲۸۱)	〃	〃	۷
دسمبر	〃 (۲:۲۶۲_۲۸۴)	〃	〃	۷

معارف نبوی

جنوری	ایمان کے اجزا اور نفاق کے اجزا	زاویۂ فراہی	صفحہ ۷
فروری	فرض عبادات	زاویۂ فراہی	〃 ۹
	اہل قدر سے قطع تعلق ۔ چھ ملعون	طالب محسن	〃 ۱۶
مارچ	مسلمان، مومن، مجاہد اور مہاجر	زاویۂ فراہی	〃 ۷
اپریل	اسلام میں بہترین بات اور انسان کے لیے خطرے کی چیز	〃	〃 ۱۱
مئی	اسلام کے پانچ ستون	〃	〃 ۹
	موت کی جگہ ۔ بچوں کا انجام	طالب محسن	〃 ۱۴
جون	اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کی علامات	زاویۂ فراہی	〃 ۱۱
جولائی	نماز عصر کا وقت	〃	〃 ۱۵
اگست	نماز فجر کا وقت	〃	〃 ۱۱
ستمبر	نزول وحی کی کیفیت	زاویۂ فراہی	〃 ۱۱
	زندہ درگور کا انجام	طالب محسن	〃 ۱۵
اکتوبر	اوقات نماز	زاویۂ فراہی	〃 ۹
	تقدیر کی تفصیل	طالب محسن	〃 ۱۲
نومبر	جماعت میں تاخیر سے شمولیت	زاویۂ فراہی	〃 ۱۹
دسمبر	نماز فجر اور نماز عصر کا اختتامی وقت	〃	〃 ۱۷
	تقدیر اور شک وشبہ	طالب محسن	〃 ۲۱

دین و دانش

جنوری	قانونِ معاشرت	جاوید احمد غامدی	صفحہ ۹
مارچ	دین کا صحیح تصور	〃	〃 ۱۱

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اپریل	قانونِ دعوت	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۱۳
مئی	قانونِ جہاد	″	″	۱۹
جون	قانونِ معیشت	″	″	۲۷
جولائی	قانونِ عبادات (۱)	″	″	۱۹
اگست	قانونِ عبادات (۲)	″	″	۱۵
ستمبر	قانونِ عبادات (۳)	″	″	۱۹
اکتوبر	قانونِ عبادات (۴)	″	″	۱۵
	قانونِ سیاست	″	″	۲۰
نومبر	قانونِ عبادات (۵)	″	″	۲۳
دسمبر	قانونِ عبادات (٦)	″	″	۲۳

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شذرات

جنوری	قانون معاشرت ـــــ خصوصی اشاعت	منظور الحسن	صفحہ	۲
فروری	قربانی	″	″	۲
مارچ	تہذیب مشرق	″	″	۲
اپریل	مسئلہ عراق اور مسلمانوں کا طرز عمل	″	″	۲
مئی	نئے میدان جنگ کا انتخاب	″	″	۲
جون	اخلاقی جارحیت	″	″	۲
جولائی	اسلام اور فنون لطیفہ	″	″	۲
اگست	قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار	″	″	۲
ستمبر	استحکام پاکستان	″	″	۲
اکتوبر	اہل دعوت کا مسئلہ	″	″	۲
نومبر	روزہ	جاوید احمد غامدی	″	۲
دسمبر	مسلمانوں کا مسئلہ	منظور الحسن	″	۲

حالات ووقائع

فروری	عروج وزوال کا قانون (۱)	ریحان احمد یوسفی	صفحہ	۲۱
مارچ	عروج وزوال کا قانون (۲)	″	″	۲۵
	امریکہ کا کردار (۱)	ڈاکٹر محمد فاروق خان	″	۳۷
اپریل	امریکہ کا کردار (۲)	″	″	۳۱
	عروج وزوال کا قانون (۳)	ریحان احمد یوسفی	″	۵۷
	عراق، امریکہ اور ہم	طالب محسن	″	۶۷
مئی	عروج وزوال کا قانون (۴)	ریحان احمد یوسفی	″	۵۱
	ایک عراقی کا سوال	محمد بلال	″	۵۹
جولائی	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ (۱)	محمد عمار خان ناصر	″	۳۳
	عروج وزوال کا قانون (۵)	ریحان احمد یوسفی	″	۵۴
اگست	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ (۲)	محمد عمار خان ناصر	″	۲۳
	عروج وزوال کا قانون (۶)	ریحان احمد یوسفی	″	۵۱
ستمبر	عروج وزوال کا قانون (۷)	″	″	۲۷
	عراق پر حملہ	رابرٹ سی بائرڈ/ کاشف علی خان	″	۵۷
اکتوبر	ارض فلسطین پر یہود کا حق	محمد عمار خان ناصر	″	۴۷
	دنیا پرستی (۱)	ریحان احمد یوسفی	″	۶۰
نومبر	دنیا پرستی (۲)	ریحان احمد یوسفی	″	۴۱
دسمبر	المیۂ طالبان وافغانستان	ڈاکٹر فاروق خان	″	۴۳
	نواب زادہ نصر اللہ کی جانشینی	خورشید احمد ندیم	″	۵۴
	فکر اصلاحی کا امین	ڈاکٹر صاحب زادہ انوار احمد بگوی	″	۵۷

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اصلاح ودعوت

فروری	متفرق مضامین	کوکب شہزاد۔محمد اسلم نجمی	صفحہ	۴۷
		ریحان احمد یوسفی۔وسیم اختر مفتی		
مئی	متفرق مضامین	ریحان احمد یوسفی	〃	۶۱
اگست	متفرق مضامین	محمد بلال۔محمد وسیم اختر مفتی	〃	۵۹
ستمبر	متفرق مضامین	وسیم اختر مفتی۔ریحان احمد یوسفی	〃	۶۳
دسمبر	قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟	ریحان احمد یوسفی	〃	۳۱

وفیات

فروری	ابوشعیب صفدر علی کی یاد میں	محمد بلال	صفحہ	۳۳
اکتوبر	بندۂ مومن کی رحلت	محمد بلال	〃	۶۵
نومبر	فکر اصلاحی کا امین	جاوید احمد غامدی/منظور الحسن	〃	۵۱
〃	خالد مسعود کی یاد میں	مجیب الرحمٰن شامی/معظم صفدر	〃	۵۶
〃	علامہ خالد مسعود اور ان کی خدمات	معظم صفدر	〃	۵۸
〃	خالد مسعود کی رحلت	طالب محسن	〃	۶۳
〃	ہمارے ماموں جان	ڈاکٹر ام کلثوم	〃	۶۴
〃	ذکر ایک مطمئن چہرے کا	نعیم احمد بلوچ	〃	۶۷

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

تبصرۂ کتب

اگست	’’کائنات کی تخلیق‘‘	ریحان احمد یوسفی	صفحہ	۶۵
ستمبر	’’تصویر کا مسئلہ‘‘	نعیم احمد بلوچ	〃	۶۷
دسمبر	’’آئینۂ کردار‘‘	معظم صفدر	〃	۶۱

یسئلون

فروری	متفرق سوالات	شہزاد سلیم/صدیق شاہ بخاری	صفحہ	۴۱

ادبیات

جنوری	غزل	جاوید احمد غامدی	صفحہ	۱۰۹
فروری	غزل	〃	〃	۶۱
مارچ	غزل	〃	〃	۶۳
اپریل	غزل	〃	〃	۶۹
مئی	شہر آشوب	〃	〃	۶۶
جون	غزل	〃	〃	۶۹
جولائی	''رجعت پسندی''	ڈاکٹر خورشید رضوی	〃	۶۵
	غزل	جاوید احمد غامدی	〃	۷۱
اگست	غزل	〃	〃	۷۰
ستمبر	سورۂ تین کی منظوم ترجمانی	مرزا آصف رسول	〃	۷۰
اکتوبر	غزل	جاوید احمد غامدی	〃	۶۹
نومبر	غزل	〃	〃	۷۱
دسمبر	غزل	〃	〃	۷۱

اشاریہ

دسمبر	اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۰۳ء	معظم صفدر	صفحہ	۶۵

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

— جاوید

O

یہ دورِ جہاں کیا ہے؟ دریا بہ حباب اندر
پنہاں بہ حباب اندر ، پیدا بہ حباب اندر
خاکی ہو کہ افلاکی ، یہ سیر و سفر تیرا
ناقہ بہ حباب اندر ، صحرا بہ حباب اندر
صوفی کی شریعت میں دو حرف یہی پائے
دنیا بہ حباب اندر ، عقبیٰ بہ حباب اندر
مے خانۂ ہستی کا یہ رنگ بھی دیکھا ہے
مستی بہ حباب اندر ، صہبا بہ حباب اندر
اک طرفہ تماشا ہے افرنگ کا طوفاں بھی
آدم بہ حباب اندر ، حوا بہ حباب اندر

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org